بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

اس وقت پوری دنیا میں مسلمان عجیب بے بسی کی حالت سے دوچار ہیں، ہر طرف ان کے خون ناحق سے ہولی کھیلی جارہی ہے، جہاں اقلیت میں ہیں وہاں اکثریت کے ہاتھوں، یا اکثریت کے رحم وکرم پر قائم برسر اقتدار طاقت کے ذریعہ ظلم وستم اور سفاکیت کا نشانہ بن رہے ہیں۔ برما کے واقعات کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے ہیں، جس طرح روہنگیائی مسلمانوں کو برما کی بدھشٹ حکومت اور بودھ مذہب کے ماننے والے لوگوں کے ہاتھوں تہ تیغ کیا گیا، ان کی بستیاں تاخت وتاراج کی گئیں، خواتین کی عصمت وعفت اور عزت وآبرو کو تار تار کیا گیا، چھوٹے چھوٹے اور معصوم بچوں کو جس بے رحمی اور بے دردی کے ساتھ ذبح کیا گیا، وہ موجودہ مہذّب، متمدن اور ترقی یافتہ دنیا کے ایسے خوں چکاں اور اندوہناک واقعات ہیں، جن کے سامنے تاریخ کے تاریک دور کے واقعات بھی ماند پڑجاتے ہیں۔ ہزاروں بے قصوروں کی تباہی وبربادی، خواتین کی آبروریزی اور معصوم بچوں کی خوں ریزی کے باوجود میانمار سرکار اور وہاں کے ظالم حکمرانوں اور تشدد پر آمادہ عوام کے خلاف عالمی طاقت کی طرف سے کوئی مؤثر کارروائی نہیں ہوئی، اور نہ مسلم کمیونٹی پر ہونے والے ظلم وتشدد کو روکنے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی گئی، نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی روہنگیائی مسلمان کس مپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں، لاکھوں بے گھر ہیں، کتنے دانے دانے کے محتاج ہیں، اور کتنے ایسے ہیں جو روٹی کے چند ٹکڑوں کے واسطے دردر کی ٹھوکریں کھارہے ہیں، اور ان سب سے زیادہ تشویشناک حالت ان خواتین کی ہے جو ہَوَس پرستوں کی ہَوَس ناک خواہشات کا نشانہ بن رہی ہیں۔

مسئلہ صرف برما کا نہیں ہے، نہ صرف کسی ایک خطے اور علاقے کا ہے، مسئلہ عالمی سطح پر مسلمانوں کی زبوں حالی کا ہے، اگر کہیں ان کا حال اچھا بھی ہے، تو مستقبل کی طرف سے تشویش اور

اندیشے لاحق ہیں، شاید ہی دنیا کے کسی خطے کا باشعور مسلمان ہو جو بے چینی اور بے اطمینانی کا شکار نہ ہو۔ کہیں ان کے اوپر مذہب کے نام پر جارحیت کی جارہی ہے، کہیں مسلک کے نام پر تشدد کیا جارہا ہے، کہیں نظریاتی اختلاف کی بنیاد پر ان کے اوپر شکنجہ کسا جارہا ہے۔ الغرض اسلام کے نام لیوا اس وقت ایک ایسی حالت اور آزمائش سے دوچار ہیں، جو انتہائی تشویشناک، ناگفتہ بہ اور کرب انگیز ہے، اور آگے حالات کیسے ہوں گے، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

گزشتہ چند سالوں سے عالم اسلام میں مسلمانوں کا خون سیلاب کی طرح بہہ رہا ہے، افغانستان، عراق، لیبیا، مصر، شام، فلسطین وغیرہ کی زمینیں مسلمانوں کے خون سے لہولہان ہوگئی ہیں۔ اس وقت ملک شام کا حال سب کے سامنے ہے، جہاں برسوں سے سنی مسلمانوں کو نہایت سفاکانہ اور بہیمانہ انداز میں تہ تیغ کیا جارہا ہے۔ موجودہ شامی حکمراں بشار الاسد کو سنی مسلمانوں سے دشمنی اور ان کی خوں ریزی اپنے باپ سے وراثت میں ملی ہے، لیکن اس نے ظلم وبربریت کی حدوں کو پار کرتے ہوئے سابقہ تمام روایتیں توڑ دی ہیں، اس کے حکم اور اشارے پر تقریباً سات سال سے مسلمانوں کا خون بہایا جارہا ہے۔ دمشق اور حلب وغیرہ جن کا شمار دنیا کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے، اور جو اسلامی دورو کے ترقی یافتہ شہروں میں تھے، جن سے اسلام کی سنہری تاریخ وابستہ رہی ہے، ان کی محض اس وجہ سے اینٹ سے اینٹ بجا کر کھنڈرات میں تبدیل کر دیا گیا کہ یہ سنی مسلمانوں سے معمور تھے۔ اس وقت ادلب اور غوطہ جو شام کا انتہائی خوبصورت اور دلکش شہر ہے[1] ستمگروں کے نشانے پر ہے، جہاں کئی دنوں سے مسلسل بموں کی بارش برسائی جارہی ہے، اور شامی حکومت اور اس کی حلیف قوتوں کی ظالمانہ کارروائیوں سے ایک ہفتے کے اندر سیکڑوں افراد جاں بحق ہو چکے ہیں، اور اس سے بڑی تعداد میں لوگ زخموں سے چور ہو کر تڑپ رہے ہیں، ظلم وستم کا شکار ہونے والے یہ سب بے قصور شہری ہیں، جو سیاست دانوں اور حکمرانوں کی باہمی عداوت اور دشمنی کا نشانہ بن رہے ہیں۔ یہ مظلوم ومقہور اور ستم رسیدہ عوام ایسے بے یار ومددگار ہیں، کہ اقوام متحدہ یا دوسری تنظیموں کے امدادی دستے بھی

---

(۱) غوطہ: شام کا وہ خطہ ہے، جس کے بارے میں یاقوت حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے: وهي بالإجماع أنزه بلاد الله وأحسنها منظراً وهي إحدى جنان الأرض الأربع (۲۱۹/۱۴) یعنی غوطہ روئے زمین کا سب سے پرفضا اور خوبصورت ترین شہر ہے، اور اس کا شمار دنیا کی چار جنتوں میں ہوتا ہے، پھر ان چاروں کا نام لکھ کر غوطہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ان سب میں سرفہرست ہے۔

ان تک پہنچ نہیں پا رہے ہیں۔ ان تمام ظالمانہ کارروائیوں کے باوجود عالمی طاقتیں صرف اس وجہ سے خاموش تماشائی بنی ہوئی ہیں یا شام کے مظلوموں کو نظر انداز کر رہی ہیں، کہ یہ خون مسلمانوں کا ہے، اور دنیا والوں کی نگاہوں میں مسلمانوں اور دوسروں کے خون میں فرق ہوتا ہے۔ مسلمانوں کا خون ارزاں اور بے قیمت ہے، اور دوسروں کا قیمتی اور گراں۔

موجودہ حالات ہم کو بار بار صادق ومصدوق آنحضور سرور عالم ﷺ کی اس حدیث کی یاد دلاتے رہتے ہیں جس میں آپ نے فرمایا ہے: **یوشک الأمم أن تداعی علیکم کما تداعی الأکلة إلی قصعتها، فقال قائلٌ: ومن قلة نحن یومئذٍ قال: بل أنتم یومئذٍ کثیرٌ، ولٰکنکم غثاءٌ کغثاءِ السیل، ولینزعن اللّٰہ من صدور عدوکم المهابة منکم، ولیقذفنّ اللّٰہ في قلوبکم الوهن، فقال قائل: یا رسول اللّٰہ، وما الوهن؟ قال: حب الدنیا وکراهیة الموت.**

آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ وقت قریب ہے کہ قومیں تم پر (مسلمانوں پر) اس طرح ٹوٹیں گی جس طرح بھوکے پیالوں پر ٹوٹتے ہیں، کسی صحابی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا اس وقت ہم (تعداد میں) کم ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمھاری تعداد اس وقت بہت ہوگی، مگر سیلاب کے جھاگ کی طرح (بے حیثیت) ہوگے، اور اللہ تعالیٰ تمھارے دشمنوں کے سینوں سے تمھارا ڈر نکال دے گا اور تمھارے دلوں میں وہن ڈال دے گا، کسی صحابی نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! وہن کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دنیا کی محبت اور موت کی ناگواری۔

مسلمانوں اور مسلم ممالک کو ظلم وستم اور ملک گیری کی ہوس کا کس طرح نشانہ بنایا جاتا ہے، اس کا معمولی سا اندازہ چند دنوں پہلے اخبار میں شائع ہونے والے سی آئی اے کے سربراہ کے بستر مرگ پر دیے جانے والے اس بیان سے ہوسکتا ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی عمارت سے ٹکرانے والا طیارہ بغیر پائلیٹ کا تھا، اور اس سے پینٹا گن کی عمارت میں بیٹھ کر امریکی خفیہ ایجنسی نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی عمارت کو نشانہ بنایا تھا۔ امریکہ کی اس فرضی کارروائی کا نتیجہ کیا ہوا تھا وہ سب کو معلوم ہے کہ افغانستان کی سرزمین کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، اس کی طالبان حکومت کے پرخچے اڑادیے گئے، اس کے چپے چپے پر بم برسائے گئے، بے قصور عوام کا بے دریغ خون بہایا گیا، اور آج بھی وہاں خون ریزی کا خوفناک سلسلہ جاری ہے۔ یہ سب آج کی مہذب، ترقی یافتہ اور امن پسند دنیا کی ''امن پسندانہ'' کارروائیاں ہیں۔

آج شامی عوام بالخصوص سنی مسلمانوں پر عرصۂ حیات ایسا تنگ کر دیا گیا ہے، کہ لاکھوں شہری اپنا وطن اور گھر بار سب چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ہیں، بہت بڑی تعداد میں شام کی سرحد عبور کر کے ترکی میں پناہ گزینی کی زندگی گزار رہے ہیں، اس کے علاوہ ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جو اپنی زندگی بچانے کے لیے قریب کے یوروپی ملکوں میں جا کر رہ رہے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی جان بچانے میں تو کامیاب ہو گئے، لیکن ان کا دین وایمان سخت خطرے میں ہے، اور ارتداد کا خطرہ ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے۔

دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک ہو رہا ہے، اس کا منفی اثر ہندوستان کے حالات پر بھی پڑا ہے، یا پڑ رہا ہے۔ اس ملک کے عوام اور سیاسی لیڈران کی بڑی تعداد تو حقیقت یہ ہے کہ یہاں کی جمہوریت، سیکولر نظام، گنگا جمنی تہذیب اور مشترکہ تہذیبی روایات اور اس کی طاقت وقوت پر یقین رکھتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس کی نگاہ میں اقلیتوں کا وجود کانٹے کی طرح چبھ رہا ہے، اور یہ طبقہ آزادی کے وقت سے بلکہ انگریزوں کے دور سے ہی مسلمانوں کے حقوق کو سلب کرنے، ان پر مشق ستم کرنے اور عزت کی زندگی سے محروم کرنے کی کوشش اور تدبیریں کر رہا ہے۔ اور گزشتہ چند برسوں سے ملک کے حالات میں جو تبدیلی آئی ہے اس نے ان کے حوصلوں کو کافی بلند کر دیا ہے۔

موجودہ حالات و واقعات مسلمانوں کو سوچنے اور غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں، لیکن ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ہماری قوت فکر وعمل مفلوج ہو کر رہ گئی ہے، ہمارا ضمیر اور احساس مردہ ہو چکا ہے، ہماری زندگی عمل سے تو عاری ہی ہو چکی ہے، ہم نے سوچنا سمجھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ آج ہمارا جو حال ہو چکا ہے وہ ہر وقت یہ خیال دلاتا رہتا ہے کہ اگر ہماری بے حسی، بے شعوری اور ناسمجھی کا یہی حال رہا تو خدانخواستہ وہ دن دور نہیں ہے کہ جو باقی ماندہ عزت یا حیثیت ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ ہم سوچتے ہی نہیں کہ ہماری بیماریوں کا علاج صرف اسلام اور اس کی تعلیمات میں مضمر ہے، خدا اور اس کے رسول کی اطاعت ہی ہماری عزت وسربلندی کا واحد ذریعہ ہے، اور یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم اپنی عظمت رفتہ کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں، اس کے علاوہ ہم جو بھی راہ اختیار کریں گے وہ مہلک، تباہ کن اور ذلت آمیز ہوگی۔

ماخوذ: از تفسیر عزیزی (مسلسل)

تفسیر سورۃ البروج

ایک سوال اور اس کا جواب:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کافروں کی جزا بیان کرتے ہوئے فاء جزائیہ لائے، چنانچہ فرمایا ''فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ'' مگر مسلمانوں کی جزاء بیان کرتے ہوئے اس حرف کو چھوڑ دیا، اس میں کیا نکتہ ہے؟ چنانچہ فرمایا ''لَهُمْ جَنّٰتٌ'':

جواب اس کا یہ ہے کہ آخرت کا ثواب یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، عمل پر موقوف نہیں ہے، جیسے نابالغ لڑکا کہ جس نے کوئی عمل نہیں کیا اس کو بھی ثواب عطا ہوگا، یا کوئی مجنون جو بلوغت سے پہلے ہی جنون کا شکار ہوگیا (عمل کا مکلّف ہی نہ ہوسکا) اس کو ثواب عطا ہوگا۔

پہاڑ کی چوٹی پر رہنے والا اسلام سے ناواقف آدمی:

یا جیسے وہ شخص جو پہاڑ کی چوٹی پر بالغ ہوا اور اسلام کے طریقہ سے واقف ہی نہ ہوسکا اور عبادت وطاعت کی توفیق بھی نہ پائی، اس کو بھی آخرت میں ثواب عطا ہوگا، یہ سب لوگ بغیر عمل کے ثواب پائیں گے۔

بخلاف عذاب کے کہ وہ بغیر فسق یا کفر کے نہیں دیا جائے گا، اس لیے کہ عذاب عدل کا تقاضا کرتا ہے اور عدل بغیر سبب کے ہو نہیں سکتا، تو ان دو چیزوں ''فضل اور عدل'' کے درمیان فرق ہونے کی وجہ سے کافروں کی جزا بیان کرتے وقت سبب وتعقیب کی تصریح فرما کر فاء لائے اور یہاں حذف کردیا۔

وہ ظالم لوگ جو مسلمانوں کو محض ایمان کی وجہ سے ایذاء رسانی کرتے تھے، اور وہ مظلوم ان کے جور وجفا پر جو صبر وتحمل کرتے تھے، ان دونوں کے ساتھ حق تعالیٰ نے دنیا وآخرت میں جو معاملہ کیا (جس کا ذکر ابھی گذرا) اس سے یہ ثابت ہوا کہ:

اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌo

بیشک تیرے رب کی پکڑ سخت ہے

رب کی پکڑ اس لیے سخت ہے کہ اوروں کی پکڑ سے تو چھٹکارا ممکن ہے، خواہ طاقت سے ہو، یا منت وزاری سے، یا صبر وتحمل سے، یا کسی کی سفارش سے، لیکن اللہ کی پکڑ سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔

اور یہ وجہ بھی ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی پکڑ کی زیادہ سے زیادہ سختی یہ ہوگی کہ ہلاک کردے گا، مگر موت کے بعد عذاب دینے کی اس کو قدرت نہیں ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت سے تو خاک ہوجانے کے بعد بھی خلاصی ممکن نہیں۔ وہ اس بات پر قادر ہے کہ زندہ کرے اور مارڈالے، پھر زندہ کرکے مارڈالے، اور اسی طرح ابدالآباد تک عذاب میں گرفتار رکھے، اس لیے کہ:

اِنَّہٗ ھُوَ یُبۡدِئُ وَیُعِیۡدُo

بیشک وہی کرتا ہے پہلی مرتبہ اور دوسری مرتبہ

یعنی وہی اول مرتبہ پیدا کرتا ہے اور فنا کے بعد دوسری مرتبہ بھی وہی پیدا کرے گا۔

وَھُوَ الۡغَفُوۡرُ الۡوَدُوۡدُo

اور وہی بخشنے والا محبت کرنے والا

یعنی وہ اللہ سخت گیری اور قہاری کی صفت رکھنے کے باوجود اپنے مسلمان بندوں کو بخشنے والا، اور ان سے محبت ودوستی کرنے والا ہے دوستی بھی ایسی شدید کہ اس کی وجہ سے اپنے دوستوں کے گناہوں کو معاف کرتا اور ان کے عیبوں کو چھپاتا ہے، اور دوستوں، دشمنوں کے ساتھ اس کا یہ معاملہ کیوں نہ ہو کہ وہ........

ذُو الۡعَرۡشِ الۡمَجِیۡدُo

مالک عرش کا بڑی شان والا

یعنی سارے جہاں کی سلطنت کے تخت کا مالک ہے، اس کی بزرگی، عظمت وبڑائی ازل سے ہے۔

''مجد'' لغت میں خاندانی اور موروثی عظمت وبڑائی کو کہتے ہیں، اور موروثی عظمت وبڑائی

کے لیے قدامت اور دوام لازم ہے، سو یہاں بھی مراد قدیم و پرانی اور دائمی عظمت و بڑائی ہے۔

اور قدیم السلطنت (پرانی چلی آنے والی بادشاہت کے) بادشاہوں کی عادت ہے کہ وہ اپنے دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ خوشی، ناراضگی کا معاملہ اسی طرح کرتے ہیں، ورنہ ان کی سلطنت میں خلل واقع ہوجائے اور اتنے طویل زمانے تک نہ چل سکے، لیکن اللہ تعالیٰ ایسے بادشاہ ہیں کہ کوئی اور بادشاہ ایسا ہونا تصور بھی نہیں کرسکتا اس لیے کہ........

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُo

کرڈالنے والا جو چاہے

جب کسی چیز کے متعلق اس کا ارادہ ہوجاتا ہے تو پھر اس کے خلاف ہونے کا امکان ہی نہیں رہتا، یہ بات کسی بادشاہ کو حاصل نہیں، یہ بادشاہ کتنی دفعہ کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں مگر پھر وہ کام انجام دینے کے وسائل ان کو میسر نہیں ہوتے، لہذا جس شہنشاہ کی یہ شان ہو تو اس سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہئے اور اس کی رحمت کا امیدوار بھی رہنا چاہئے۔

اللہ کی صفت ''فعال'' نکرہ لانے پر اشکال کا جواب:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی صفات معرفہ لائی گئیں کہ بعض معرف باللام ہیں جیسے الغفور، الودود، اور بعض معرف باللام کی طرف مضاف ہیں جیسے **ذو العرش المجید**، مگر ''فعال'' کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے اس میں کیا نکتہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی معرفہ کے حکم میں ہے، اس لیے ''تعریف'' کی ضرورت نہیں۔ وہ اس طرح کہ ''**فعال لما یرید**'' طالعاً جبلاً کی طرح مشابہ مضاف ہے اور مشابہ مضاف، مضاف کے حکم میں ہوتا ہے۔ لہٰذا التعریف (معرفہ) کی حاجت نہ رہی۔

فائدہ: ''**فعال لما یرید**'' میں مبالغے کا صیغہ لائے ہیں، **فاعلٌ لما یرید** اسم فاعل کا صیغہ ذکر نہیں کیا۔ اسم فاعل کی بجائے مبالغے کے صیغے کو اختیار کرنے میں نکتہ یہ ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی مرادوں اور مفعولوں کی کثرت کی طرف اشارہ ہو (یعنی وہ بہت زیادہ ارادوں کو پورا کرنے والا اور اس کے افعال بے شمار ہیں)۔

ان متضاد اور مختلف آثار ونتائج والی صفات کے بیان سے مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اس مالک سے کوئی بعید نہیں کہ اپنے بندوں کے ساتھ کبھی لطف ومہربانی، مغفرت ومحبت کا معاملہ کرے اور کبھی سخت پکڑ میں گرفتار کرلے، بلکہ ایک ہی آدمی یا جماعت پر ایک وقت میں لطف وانعام کرے اور دوسرے وقت میں انتقام وعذاب میں پکڑ لے، لہٰذا اس کے انعام واکرام سے مغرور نہ ہونا چاہئے اور اس عدل وانصاف والے منتقم سے بے خوف نہیں رہنا چاہئے، چنانچہ فرماتے ہیں:

هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۝

کیا پہنچی تجھ کو بات اُن لشکروں کی

یعنی جن پر ایک طویل مدت تک انعام واکرام کا دروازہ کھلا رہا، طرح طرح کی نعمتیں ان کو پہنچتی رہیں، پھر کیسا انتقام ان سے لیا گیا، اور ان لشکروں پر عذاب کا سبب بھی وہ کمزور اور تھوڑے سے لوگ ہوئے جن کو یہ لشکروں والے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کے بل بوتے پر بہت ذلیل کیے ہوئے تھے۔

فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ۝

فرعون اور ثمود کے

فرعونیوں کو ایک مدت تک حکومت ونعمت عطا کیے رکھی، جس کی وجہ سے ان کو بنی اسرائیل پر مکمل تسلط وغلبہ حاصل تھا، چنانچہ وہ ان سے بیگار لیتے اور انتہائی ذلت آمیز سلوک کرتے تھے، پھر چند روز کے اندر وہ تمام مال واسباب، حکومت واقتدار فرعونیوں سے چھین کر بنی اسرائیل کے حوالے کردیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے فرعونیوں کو دریائے قلزم میں غرق کردیا۔

قوم ثمود کی مادی ترقی:

قوم ثمود کو بھی بہت طاقت وقوت سے نوازا، یہاں تک کہ ان کی ایک ہزار سات سو بستیاں آباد تھیں، جو سب کی سب سنگ تراشی کر کے بنائی گئیں تھیں، وہ حضرت صالح علیہ السلام، کمزور مسلمانوں اور حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کے ساتھ ہتک آمیز رویہ اپنائے ہوئے تھے، جس کے سبب وہ سب کے سب ایک کڑک سے ہلاک کردیے گئے، اور وہاں کے بد بخت اور شر پسند لوگ حضرت صالح علیہ السلام کی

بددعا سے اندھے ہوگئے۔

پس یہ قصے عقلمندوں کی عبرت کے لیے کافی ہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ کے انعام پر مغرور نہ ہوں اور اس کے انتقام سے ڈرتے رہیں۔ مگر کافر لوگ عبرت نہیں پکڑتے، وہ غرور و بے خوفی میں گرفتار ہیں۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍo

کوئی نہیں بلکہ منکر جھٹلاتے ہیں

یعنی یہ کافر لوگ ان قصوں سے عبرت پکڑنے کی بجائے ان کو جھٹلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اہل تاریخ نے محض غرابت پیدا کرنے کے لیے یہ قصے گھڑ لیے ہیں، حالانکہ وہ یہ غور نہیں کرتے کہ فرض کرو یہ قصے حقیقت نہ بھی ہوں تو اللہ کی قدرت تو ہر شخص ہر وقت نمایاں دیکھ رہا ہے کہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے، پھر اگر وہ اپنے وجود کے اندر ہی غور کر لیں تو ان کو اللہ کی قدرت معلوم ہو جائے کہ صرف سانس کو ہی دیکھیں جس پر انسان کی زندگی قائم ہے، یہ بھی اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَائِهِمْ مُّحِيْطٌo

اور اللہ نے اُن کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو آگے سے پیچھے سے گھر رکھا ہے، ان سے پہلے زمانے کے سرکشوں کو اس نے ہلاک کیا، اور ان کے بعد بھی بہت سوں کو ہلاک کرے گا، لہٰذا ایسے واقعات جو ہر وقت نمودار ہوتے رہتے ہیں ان کا انکار کرنا بالکل بے جا ہے۔

لفظ ''وراء'' کی لغوی تحقیق:

یہ لفظ اصل لغت میں اس چیز پر بھی بولا جاتا ہے جس کو کوئی دوسری چیز چھپائے، اور اس پر بھی بولا جاتا ہے جو کسی دوسری چیز کو چھپائے، اسی طرح ''آگے'' کے لیے بھی یہ بولا جاتا ہے، جس طرح ''پیچھے'' کے معنی میں آتا ہے، آیت میں اشتراک معنوی، یا عموم مجاز کے طور پر دونوں معنوں کو شامل ہے۔

آگے یہ بیان فرماتے ہیں کہ اوپر کا قصہ صرف اہلِ تاریخ نے ہی بیان نہیں کیا بلکہ یہ قرآنِ قدیم ہے، خارج میں عملی طور پر اس قصے کے وقوع سے پہلے یہ لکھا ہوا ہے، چنانچہ فرمایا:

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ۝ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ۝

کوئی نہیں یہ قرآن ہے بڑی شان کا لکھا ہوا لوح محفوظ میں

لوحِ محفوظ کی تحقیق:

یعنی یہ قصہ ایک ایسی تختی پر لکھا گیا ہے، جو انسانوں، جنوں اور شیاطین کے دخل سے محفوظ ہے، اس کے اندر کوئی تصرف نہیں کرسکتا، ایسا ممکن نہیں کہ اس میں کوئی کمی یا زیادتی کر سکے، یا تحریف والحاق کر سکے، لہٰذا ایسی محفوظ چیز کے متعلق جھوٹ یا بناوٹ کا گمان کرنا خلافِ عقل ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر معالم التنزیل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی سند سے ایک روایت نقل کی ہے کہ "لوح محفوظ" ایک سفید موتی کی طرح ہے، جس کی لمبائی اتنی ہے جتنی زمین سے آسمان تک ہے، اور چوڑائی کا فاصلہ اتنا ہے جتنا مشرق ومغرب کے درمیان ہے، اور اس کے کناروں پر یاقوت جُڑے ہوئے ہیں، اس کی دونوں دفتیاں (جلد کے گتے) سرخ یاقوت کی ہیں، نور کے قلم سے اس میں کلام قدیم لکھا ہوا ہے، اس کا ایک سِرا عرش سے معلق ہے، نچلا سِرا ایک معزز فرشتے کی گود میں ہے اور وہ عرشِ عظیم کی دائیں طرف کھڑا ہے، اس لوح کے سرے پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

"لا اله إلا اللّٰه وحده دينه الإسلام ومحمد عبده ورسوله فمن اٰمن باللّٰه عز وجل وصدق بوعده واتبع رسوله أدخله الجنة" اللّٰهم اجعلنا منهم.

الازہار المربوعہ
(مسلسل)

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

پھر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو پہلے ہی اظہار خیال کر چکے تھے اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم معلوم کر کے یہ پوچھا کہ کیا یہ حرام ہے؟ اس کے بعد جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے حکم کی علت سمجھائی تب حذیفہ نے خاموشی اختیار کی، بہر حال مطلقاً خاموش رہنا ان دونوں واقعوں سے بھی ثابت نہیں ہے۔

اسی موقع پر مجیب نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث کی ایک عبارت سے بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ صحابہ کو حضرت عمر کی مخالفت کی تاب وطاقت نہ تھی۔ لیکن بخدا یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہ پر نہایت سخت الزام ہے اور یہ وہ طعن ہے جو شیعوں کی خصوصیات مذہب میں سے ہے اور کوئی صاحب عقل باور نہیں کر سکتا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ -جن کی اس لاجواب کتاب کا موضوع ہی درحقیقت ردشیعہ ہے- شیعوں کے اس عقیدہ کی تائید فرمائیں گے۔

اصل یہ ہے کہ مجیب نے ازالۃ الخفاء کی عبارت کا مطلب ہی نہیں سمجھا اور یہ کوئی عجیب بات نہیں، ان کے فہم کا نمونہ آپ بار بار دیکھ چکے ہیں، ازالۃ الخفاء تو بڑی چیز ہے معمولی معمولی باتیں بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتیں، حضرت شاہ صاحب نے کہیں پر مجیب کی طرح یہ نہیں لکھا ہے کہ صحابہؓ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مخالفت سے خائف رہتے تھے (آثار ص ۳۸) اور نہ انھوں نے یہ کہیں بھی لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو چاہتے تھے حکم دیتے تھے کوئی بول نہیں سکتا تھا، بلکہ شاہ صاحب نے اسی ازالۃ الخفاء میں متعدد واقعات میں صحابہ کا ٹوکنا اور مخالفت کرنا ذکر کیا ہے، پس اپنے لکھے ہوئے ان واقعات کے علاوہ وہ کیونکر لکھ سکتے ہیں۔

باقی مجیب نے جس عبارت سے یہ غلط نتیجہ نکالا ہے اس کی مراد یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

مسائل وغیرہ میں صحابہ سے مشورہ لیا کرتے تھے اور ان کی مجلس مشاورت میں صحابہ کے سامنے پیش ہوکر جو مسئلہ جس طرح طے ہوتا تھا اسی طرح لوگوں کو بتایا جاتا تھا[۱] انھیں طے شدہ مسائل کی نسبت حضرت شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ جب ان مسائل پر بحث ہولیتی تھی اور ایک بات منقح کر کے خلیفہ اس کا پختہ ارادہ کرلیتا تھا تو اب کسی کو مخالفت کی مجال نہ رہتی تھی۔ اور یہی ہونا بھی چاہئے ورنہ مجلس مشاورت کے قیام کا کوئی فائدہ نہیں۔

اب ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو بات لکھی ہے وہ قطعاً میرے خلاف نہیں ہے، میں یہ کب کہتا ہوں کہ مشورہ مکمل ہوجانے اور بحث کے اختتام اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عزم مصمم کے بعد کوئی ان کو ٹوکتا۔ میری غرض تو یہ ہے کہ ان کے عزم سے پہلے کیوں نہیں ٹوکا گیا یہ تو اس صورت میں جب مشورہ لیا ہو اور اگر بے مشورہ کے فرمایا تھا تو جس طرح رجم مجنونہ وحاملہ کے واقعہ میں ٹوکا گیا تھا اسی طرح یہاں بھی کیوں نہ ہوا۔

حاصل کلام یہ کہ ابن القیم کا خیال بالکل غلط ہے، ورنہ صحابہ ہرگز خاموش نہ رہتے۔ اس گزارش کے بعد اب ناظرین خود فیصلہ کرلیں کہ سرمایۂ دلائل کے فقدان کے باعث مؤلف بے حد پریشان ہے۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

ثالثاً:- حیرت ہے کہ علامہ نے حضرت فاروق اعظم کی جانب تین یکجائی طلاقوں کے جائز رکھنے کی نسبت کس طرح کی جب کہ وہ خود اسی اغاثۃ اللہفان ص ۱۷۳ میں لکھ چکے ہیں کہ جب تین طلاق دینے والا ان کے پاس لایا جاتا تھا تو درد پہنچانے والی سزا دیتے تھے اور اس کی بی بی کے حرام ہوجانے کا فتویٰ دیتے تھے، سوال یہ ہے کہ جائز کام پر سزا کیسی؟

صاحب آثار لکھتے ہیں کہ یہ بعینہ پہلا اعتراض ہے الخ

جواب:- لیکن بنیاد الگ الگ ہے، پہلا اعتراض ابن القیم کی ''اعلام الموقعین'' کی ایک عبارت کی بنا پر تھا اور یہ اعتراض ''اغاثہ'' میں حضرت عمر کے مذکورہ بالا اثر کے ذکر کرنے پر۔

---

(۱) شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں: كان من سيرة عمر انه كان يشاور الصحابة ويناظر هم حتىٰ تنكشف الغمة ويأتيه العلم فصار غالب قضاياه وفتاواه متبعة في مشارق الأرض ومغاربها یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ وہ صحابہ سے مشورہ اور مناظرہ کیا کرتے تھے یہاں تک کہ ابہام والتباس دور ہوجائے، اسی لیے ان کے اکثر فیصلے اور فتوے مشرق ومغرب میں مانے گئے ۱۲ منہ

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

رابعاً: – اس پریشان کلامی کی بھی کوئی حد ہے کہ یہاں تو لکھ دیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تین طلاقوں کو جائز سمجھتے تھے اور زادالمعاد واعلام الموقعین میں اس کے بالکل خلاف لکھا، اعلام (۲۶/۲) میں لکھتے ہیں کہ جب لوگوں نے اللہ سے ڈرنا چھوڑ دیا اور کتاب اللہ سے کھیل کرنے لگے اور غیر شرعی طلاق دینے لگے تو جس چیز کا لوگوں نے التزام کیا اس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان پر لازم کر دیا ان کو سزا دینے کے لیے الخ، اور زادالمعاد (ص ۱۹۱ بر ہامش زرقانی ج ۷) میں لکھتے ہیں: **لم یخالف عمر اجماع من تقدمه بل رأیٰ إلزامهم بالثلاث عقوبة لهم لما علموا انه حرام وتتابعوا فیه.** یعنی حضرت عمر نے اپنے سے پہلے صحابہ کے اجماع کی مخالفت نہیں کی، بلکہ انھوں نے تین طلاق کے لازم کرنے کو لوگوں کی سزا کے لیے مناسب خیال کیا بدیں وجہ کہ لوگ اس کو حرام جانتے ہوئے پے بہ پے اس کے مرتکب ہوئے۔

یہ عبارتیں دلالت کرتی ہیں کہ حضرت عمر کے نزدیک تین طلاق حرام تھی، ان کا واقع کرنا کتاب اللہ کے ساتھ کھیل کرنا تھا، یہ طریقۂ طلاق غیر شرعی طریقہ تھا، اس لیے ان کو سزا دی۔

ایسا صریح تعارض وتہافت علامہ ابن القیم کے کلام میں محل تعجب ہے! کیا ہمارے مخالفین بتا سکتے ہیں کہ ان دونوں میں کون سی بات صحیح ہے۔

صاحب آثار نے اس اعتراض کے جواب میں تین صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں، لیکن جو جواب دیا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ زادالمعاد کی عبارت منقولہ بالا جس میں ثلاث مجموع کے حرام ہونے کی تصریح ہے اس کی نسبت بجز اس کے اور کچھ نہیں لکھ سکے کہ زادالمعاد کی عبارت کا بھی یہی مطلب ہے، یعنی جو اعلام الموقعین کی عبارت کا ہے؛ لیکن یہ صریح جھوٹ ہے اس لیے کہ اس میں صاف صاف تین طلاقوں (ثلاث مجموع) کو حرام لکھا ہے۔ اگر مجیب صاحب اور ان کے اعوان میں جرأت ہو تو اپنے اس دعویٰ کو ثابت کریں۔ اعلام الموقعین کی عبارت کی نسبت بے شک بہت کچھ لکھا ہے، لیکن جو کچھ لکھا ہے وہ خلاف واقعہ ہونے کے علاوہ پریشان کلامی کا بدترین اور نہایت مضحکہ خیز نمونہ ہے، چنانچہ اعلام الموقعین کی عبارت کا ترجمہ تو یوں کرتے ہیں:

جب لوگوں نے اللہ سے ڈرنا چھوڑ دیا اور کتاب اللہ سے کھیل کرنے لگے اور غیر مسنون

طلاق دینے لگے (یعنی ایک ساتھ تین طلاقیں بکثرت دینے لگے) تو عمر رضی اللہ عنہ نے ان پر لازم کر دیا الخ (ص ۱۴۱)

یعنی یہاں اللہ سے ڈرنا چھوڑ دینے اور کتاب اللہ سے کھیل کرنے کی مراد یہ بتائی ہے کہ ایک ساتھ تین طلاقیں بکثرت دینے لگے۔ اور بکثرت تین طلاق دینا ہی ان کے لازم کرنے کا سبب تھا۔ لیکن ص ۱۴۲، سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سے ڈرنا چھوڑنے کی مراد یہ ہے کہ تین طلاق دیتے تھے اور تین ہی مراد لیتے تھے یا مشتبہ رکھتے تھے، اور تین طلاقوں کے لازم کرنے کا سبب یہی تھا چنانچہ ان کے یہ فقرے پڑھیے:

۱:- ان کے (یعنی عہد نبوی وصدیقی والوں کے) دلوں میں خوف الٰہی تھا، اس لیے غیر سنی طلاق مراد نہ لیتے تھے۔

۲:- اور اس زمانہ (یعنی عہد نبوی وصدیقی وابتدائے خلافت فاروقی) کے بعد تین طلاق مجموعی دیتے تھے اور تین ہی مراد لیتے تھے یا مشتبہ رکھتے تھے۔

۳:- نیتوں میں اختلاف پیدا ہو گیا اور نیت پر حکم لگانا مشکل ہو گیا تو عمر نے تینوں کے نافذ ہونے کا حکم دیا۔

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ ص ۱۴۱ میں کیا فرما رہے تھے اور اب کیا کہنے لگے۔ پھر ۱۴۳ میں فرماتے ہیں ''ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین کہنا کتاب اللہ کے ساتھ کھیل کرنا تھا۔ اور یہ طریقہ یعنی ثلاث مجموع کا واقع کرنا غیر شرعی طریقہ تھا اس لیے حضرت عمر نے اس پر سزا کی نہ نفس ثلاث مجموع پر''۔ اس عبارت میں ''تین کہنا'' سے اگر تین کی نیت کرنا مراد ہے تو یہ وہی ص ۱۴۲ والی بات ہے، لیکن الفاظ اس کی مساعدت نہیں کرتے، ایک معمولی اردوداں بھی جانتا ہے کہ تین کی نیت کرنے کے لیے تین کہنے کا لفظ نہیں بولا جاتا اور اگر ''تین کہنا'' سے تین قرار دینا (جو حاکم ومفتی کا کام ہے) مراد ہے اور یہی متبادر ہے تو اب یہ تیسری بات ہوئی اور اس کی رو سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت عمر خود اپنے کو سزا دیتے تھے۔ (معاذ اللہ) کیا یہ اختلاف بیانی اور یہ تلون صاف صاف نہیں بتا رہا ہے کہ مجیب کو میرے اس اعتراض نے بالکل حواس باختہ بنا دیا ہے۔

اس کے بعد میں چاہتا ہوں کہ مجیب کی ان تین باتوں کی نسبت ذرا تفصیل سے کچھ عرض

کروں۔

ا:- مجیب کی پہلی بات کی نسبت اولاً یہ گذارش ہے کہ انھوں نے ابن القیم کی عبارت **طلقوا علی غیر ما شرعہ اللہ** کا ترجمہ ''غیر مسنون طلاق دینے لگے'' کیا، حالانکہ اس کا ترجمہ ''غیر مشروع طریقہ پر طلاق دینے لگے'' کرنا چاہئے، غیر مشروع غیر مسنون میں جو بین فرق ہے اس کو نظر انداز کر دینا صریح مغالطہ ہے۔

ثانیاً:- ''اللہ سے ڈرنا چھوڑ دیا اور کتاب اللہ سے کھیل کرنے لگے اور غیر مشروع طلاق دینے لگے'' کی یہ مراد بیان کرنا کہ ''ایک ساتھ تین طلاقیں کثرت سے دینے لگے'' صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اس سے لازم آتا ہے کہ اتفاقیہ تین طلاق ایک ساتھ دینا اللہ سے نڈر ہونا اور کتاب اللہ سے کھیل کرنا اور غیر مشروع طلاق (یا بقول آپ کے غیر مسنون) نہیں ہے بلکہ مشروع یا مسنون ہے، حالانکہ آپ اس کے قائل نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ آپ نے تصریح فرمائی ہے کہ ''عہد نبوی........ میں ایک مجلس کی تین طلاقوں کی کثرت نہ تھی'' (ص ۱۴۲)

لہذا عہد نبوی میں کوئی واقعہ ایسا پیش آیا ہو تو وہ اتفاقیہ سمجھا جائے گا جیسا کہ آثار ص ۱۴۱ کی سطر ۲۵ سے ظاہر ہے، بایں ہمہ جب ایک شخص نے عہد نبوی میں تین طلاقیں دیں تو آنحضرت ﷺ نے اس کو کتاب اللہ سے کھیل کرنے والا فرمایا (زاد المعاد ص ۱۸۶ و ص ۱۸۷) اس سے صاف ظاہر ہے کہ چاہے اتفاقی طور پر ایسا ہے یا کثرت سے، بہر حال کتاب اللہ سے کھیل کرنا اور غیر مشروع ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ابن القیم بھی اس کے قائل نہیں ہیں چنانچہ جہاں سے مجیب نے ان کی عبارت کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے وہیں فرماتے کہ ''اس لیے کہ اللہ نے طلاق کو یکے بعد دیگرے مشروع فرمایا اور کل (تینوں طلاقوں) کے یکبارگی دینے کو مشروع نہیں فرمایا ہے پس جو شخص تینوں کو ایک ہی دفعہ میں جمع کرے (یعنی تینوں ایک ساتھ دے دے) تو وہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے آگے بڑھا اور اپنے نفس پر ظلم کیا اور کتاب اللہ کے ساتھ کھیل کیا لہذا وہ سزا کا مستحق ہے''۔ دیکھئے ابن القیم یکجائی تین طلاقوں کو سرے سے مشروع ہی نہیں مانتے اور اتفاقی طور سے ہونے اور بکثرت دیے جانے میں کوئی فرق نہیں کرتے، بلکہ مطلقاً یکجائی طلاقوں کے دینے والے کو متعدی ظالم اور کتاب اللہ سے کھیل کرنے والا کہتے ہیں۔

ثالثاً:- مجیب نے اعلام الموقعین کی عبارت کی یہ شرح کرنے کے بعد ص ۱۴۳ میں میرے اعتراض کا جو جواب دیا ہے وہ یہ ہے:

غور کیا جائے کہ اغاثہ کی عبارت میں جس میں یہ مذکور ہے کہ حضرت عمر ثلاث مجموع کو جائز فرماتے تھے۔

اور اعلام الموقعین [کی] اس عبارت میں جو ابھی مذکور ہوئی ......کون سا تعارض ہے، اعلام الموقعین کی جس عبارت کو مولف نے پیش کیا ہے اس میں کہیں ثلاث مجموع کے جواز وعدم جواز کی بحث نہیں ہے۔ (ص ۱۴۳)

کوئی مجیب صاحب سے پوچھے کہ کیا یہ کہنا کہ ''اللہ سے ڈرنا چھوڑ دیا، اور کتاب اللہ سے کھیل کرنے لگے اور غیر مشروع طلاق دینے لگے'' ناجائز کہنے کے مترادف نہیں ہے، اگر ہے تو پھر عدم جواز کی بحث کیوں نہیں ہے؟ کیا ناجائز اور حرام کا لفظ ہوتا جب ہی عدم جواز کا حکم لگانا کہا جاتا؟ اگر مجیب فرمائیں کہ یہ سب الفاظ کثرت ثلاث مجموع کی نسبت بولے گئے ہیں تو عرض ہے کہ اولاً تو اس شرح کی حقیقت اوپر منکشف ہو چکی ہے۔

ثانیاً:- آپ کا فرض ہے کہ نفس ثلاث مجموع کے جواز کے باوجود اس کی کثرت کے عدم جواز کی وجہ صاف صاف لکھیے تاکہ آپ کی قابلیت کی اچھی طرح داد دی جاسکے۔

ثالثاً:- جہاں تک آپ نے ترجمہ کر کے چھوڑ دیا ہے اس کے بعد والے فقرہ میں آپ کی دونوں باتوں کی تکذیب موجود ہے، اس فقرہ کا ترجمہ ابھی گزرا ہے۔

مجیب صاحب نے اس کے بعد ذرا زیادہ بے حجاب ہو کر لکھا ہے کہ ''ہاں اعلام الموقعین کی عبارت سے یہ البتہ معلوم ہوا کہ باعث تعزیر ثلاث مجموع نہ تھا بلکہ ثلاث مجموع کے وقوع کی نیت تھی یا اس کا التباس۔ (ص ۱۴۳)

حالانکہ یہ صریح غلط بیانی ہے، مجیب نے یا میں نے اعلام الموقعین کی عبارت کا جو ترجمہ پیش کیا ہے اس میں کہیں بھی نیت کا کوئی ذکر نہیں ہے[1]۔

---

(۱) مجیب کی اس توجیہ کے غلط ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ ابن القیم نے اس عبارت کے متصل ہی تعزیر وعقوبت کا سبب جمع ثلاث کو قرار دیا ہے اور جمع ثلاث کا معنی خود مجیب کے نزدیک ایک ساتھ تین طلاق دینا ہے (دیکھو آثار ص ۷)

اصل یہ ہے کہ جب مجیب صاحب کو کوئی بات بنتی نظر نہیں آئی تو اعلام المو قعین کی عبارت کا ترجمہ کر کے دعویٰ کر دیا کہ حافظ ابن القیم کا مطلب وہی ہے جس کو امام نووی شافعی اور مولانا عبدالحی صاحب حنفی بیان فرماتے ہیں۔لیکن مجیب کا یہ دعویٰ ان کی سخت غفلت و ناواقفیت کی دلیل ہے۔ان کو خبر نہیں ہے کہ نووی اور مولانا عبدالحی نے جو بات لکھی ہے وہ درحقیقت ابن جریج کا قول ہے اور ابن القیم نے اس کو نہایت شد و مد سے غلط قرار دیا ہے،فرماتے ہیں:**واما حملکم الحدیث علی قول المطلق أنت طالق أنت طالق أنت طالق ومقصوده التاکید بما بعد الاول فسیاق الحدیث من اوله إلی آخره یرده، فان هذا الذی أوَّ لتم الحدیث علیه لا یتغیر بوفاة رسول الله صلی الله علیه وسلم، ولا یختلف علی عهده وعهد خلفائه وهلم جراً إلی آخر الدهر ومن ینویه فی قصد التاکید لا یفرق بین بر وفاجر وصادق وکاذب بل یرده إلی نیته وکذلک من لا یقبله فی الحکم لا یقبله مطلقاً براً او فاجراً** (زادالمعاد[۱۸۶/۷])۔

حاصل اس عبارت کا یہ ہے کہ عہد نبوی اور عہد فاروقی کے حکموں کو ارادۂ تاکید وعدم تاکید یا اختلاف کی وجہ سے مختلف قرار دینا غلط ومردود ہے۔پس جس بات کو ابن القیم مردود قرار دیتے ہیں اس کو اختیار کیوں کریں گے؟ اور اگر کریں تو یہ ان کی دوسری پریشان کلامی ہے، ہمارے اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ مجیب نے ابن القیم کے اس فقرہ ’’حضرت عمر نے ان پر اس چیز کو لازم کر دیا جس کو ان لوگوں نے خود اپنے اوپر لازم کیا‘‘ کا جو مطلب سمجھا ہے وہ **توجیه القول بما لا یرضی به قائله** کا مصداق ہے۔

۲:-اور اسی بیان سے مجیب کی دوسری بات یا دوسری توجیہ کا حال بھی معلوم ہو گیا یعنی یہ کہ اللہ سے ڈرنا چھوڑنے اور کتاب اللہ سے کھیل کرنے کی یہ مراد بیان کرنا کہ تین طلاق دے کر تین مراد لیتے تھے یا مشتبہ رکھتے تھے، بالکل غلط اور ابن القیم کی تصریح کے خلاف ہے۔

۳:-اب رہی مجیب کی تیسری بات یا تیسری توجیہ تو وہ سب سے زیادہ عجیب ہے اور اس میں اپنی خوش فہمی کا بہت زیادہ مظاہرہ کیا ہے، ناظرین کو یاد ہوگا کہ میں نے اعلام المو قعین کی عبارت کا ترجمہ اور زادالمعاد کی عبارت مع ترجمہ لکھنے کے بعد اعلام مرفوعہ میں لکھا تھا کہ ’’یہ عبارتیں دلالت کرتی ہیں کہ حضرت عمر کے نزدیک تین طلاق حرام تھی، ان کا واقع کرنا کتاب اللہ کے ساتھ کھیل کرنا، یہ طریقۂ طلاق غیر شرعی طریقہ تھا اس لیے ان کو سزا دی‘‘ (اعلام ص ۲۸)

مجیب نے اپنی خوش فہمی کا پہلا مظاہرہ یہ کیا کہ میرے فقرہ نمبر ا کو لکھا کہ یہ دعوی ہے اور فقرہ نمبر ۲، ۳ کو دلیل قرار دیا، حالانکہ ایک معمولی سمجھ کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہاں نہ کوئی دعوی ہے نہ دلیل ہے، بلکہ یہاں پر میں نے ابن القیم کی عبارتوں کا حاصل بیان کیا ہے اور جن باتوں پر وہ دلالت کرتی ہیں ان کو بیان کیا ہے چنانچہ صاف تصریح کردی کہ ''یہ عبارتیں دلالت کرتی'' الخ

مجیب نے اپنی خوش فہمی کا دوسرا مظاہرہ یہ کیا کہ میرے فقرہ نمبر ۳ (یعنی ان کا واقع کرنا کتاب اللہ کے ساتھ کھیل کرنا تھا) کا مطلب اپنی طرف سے یہ بیان کیا کہ ''ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین کہنا کتاب اللہ کے ساتھ کھیل کرنا تھا'' حالانکہ یہ بالکل غلط اور اس کی نسبت میری طرف افترا پردازی ہے، میں بتا چکا ہوں کہ تین کہنا کا متبادر معنیٰ ''تین قرار دینا یا تین سمجھنا'' ہے اور تین قرار دینے یا سمجھنے کو نہ ابن القیم نے کتاب اللہ کے ساتھ کھیل کرنا لکھا ہے ورنہ ان کا کلام فاسد المعنی یا بے معنی ہو جائے گا۔ نہ میں ہی اس کا قائل ہوں اور اگر ''تین کہنا'' کی مراد تین کی نیت کرنا ہو تو اولاً تین کی نیت کرنے کے لیے تین کہنے کا لفظ بولا نہیں جاتا۔

ثانیاً: -اگر بولا بھی جاتا ہو تو تین طلاقوں کے واقع کرنے کا مطلب تین کہنا اور تین کہنے کا مطلب تین کی نیت کرنا قرار دینا بھینس کے انڈے سے گھی نکالنے کے برابر ہے۔

ثالثاً: -میں ثابت کر چکا ہوں کہ ابن القیم کے کلام میں نیت کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ ان کے نزدیک عہد نبوی و عہد فاروقی کے حکموں کا اختلاف نیت کے اختلاف پر مبنی ہے اور میں نے فقرہ نمبر ۲ میں انھیں کے ایک فقرہ کا حاصل بیان کیا ہے، لہذا میں واقع کرنا سے ''نیت کرنا'' کیسے مراد لے سکتا ہوں۔ پس ظاہر ہو گیا کہ یہ خالص مجیب کی طبع زاد بات ہے جو ان کی خوش فہمی کا ثبوت یا مغالطہ بازی کا بدترین نمونہ ہے۔

ہاں میں مجیب کو بتا دوں کہ ''واقع کرنا'' سے میری مراد ''دینا'' ہے اور فقرہ نمبر ا کا مطلب یہ ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاقوں کا دینا کتاب اللہ کے ساتھ کھیل کرنا تھا، شاید مجیب کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ایقاع ثلاث (یا تین کا واقع کرنا) دو معنوں میں بولا جاتا ہے ایک تین طلاق دینا، دوسرے تین طلاقوں کو واقع و نافذ قرار دینا یا سمجھنا۔

(جاری ہے)

اثنا عشری امامی شیعہ مذہب کے خدوخال

تحریر: سید محبّ الدین خطیب مصری　ترجمہ: مسعود احمد الاعظمی

(ساتویں قسط)

مسلمانوں کی موالات

مسلمان ہر صحیح ایمان والے مومن سے موالات رکھتے ہیں، اور اس میں بغیر کسی حصر کے اہل بیت کے صالح افراد بھی داخل ہیں، اور مسلمان جن برگزیدہ لوگوں سے محبت وموالات رکھتے ہیں ان میں سر فہرست وہ عشرۂ مبشرہ ہیں جن کو آنحضرت ﷺ نے جنت کی بشارت دی ہے۔ اگر شیعوں کی تکفیر کا اس کے علاوہ کوئی اور سبب نہ ہوتا کہ وہ ان عشرۂ مبشرہ کے اہل جنت ہونے میں آنحضرت ﷺ سے مخالفت رکھتے ہیں، تو بھی کافی ہوتا۔ اسی طرح مسلمان ان تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی محبت رکھتے ہیں جن کے شانوں پر اسلام اور عالم اسلام کی بنیاد قائم ہے، اور جن کے مبارک لہو کی آبیاری سے اسلامی وطن کی مٹی میں حق اور خیر کی فصل اُگی ہے، اور یہ وہ حضرات ہیں جن کے بارے میں شیعوں نے حضرت علی اور ان کے صاحبزادوں (رضی اللہ عنہم) کی طرف یہ غلط اور جھوٹی بات منسوب کی ہے کہ وہ صحابہ ان کے مخالف تھے، حالانکہ وہ لوگ زندگی بھر ایک دوسرے سے محبت اور تعاون کرنے والے بھائی بھائی بن کر رہے، اور اسی طرح محبت وتعاون اور برادرانہ انداز میں دنیا سے فوت ہوئے، اللہ رب العزت نے اپنی کتاب برحق کی سورۂ فتح کی انتیسویں آیت میں ان کا کتنا صحیح اور سچا وصف بیان کیا ہے، فرمایا ہے: (أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ)
ترجمہ: کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔

اور سورۂ حدید میں خداوند قدوس کا ارشاد پاک ہے: (وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى) ترجمہ: حالانکہ سب آسمان اور زمین

اخیر میں اللہ ہی کا رہ جائے گا تم میں سے جو لوگ فتح مکہ سے پہلے (فی سبیل اللہ) خرچ کر چکے اور لڑ چکے برابر نہیں وہ لوگ درجہ میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنھوں نے (فتح مکہ کے) بعد میں خرچ کیا اور لڑے اور (یوں) اللہ تعالیٰ نے بھلائی (یعنی ثواب) کا وعدہ سب سے کر رکھا ہے۔

اور کیا یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ پاک اپنے وعدہ کے خلاف کرے؟ اور اللہ نے سورۂ آل عمران آیت ۱۰۹ میں ان کی نسبت فرمایا ہے: (كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ) ترجمہ: تم لوگ اچھی جماعت ہوئی وہ لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی ہے۔

خلفاء راشدین کی باہمی محبت والفت

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اپنے پہلے کے تینوں خلفاء (حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم) سے محبت کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے حضرات حسنین اور محمد ابن الحنفیہ کے بعد پیدا ہونے والے لڑکوں کے نام ان حضرات خلفاء کے ناموں پر رکھے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ان کے ایک صاحبزادے کا نام ''ابوبکر'' ہے، اور ایک دوسرے کا نام انھوں نے ''عمر'' اور تیسرے کا نام ''عثمان'' رکھا۔ اپنی صاحبزادی حضرت ''ام کلثوم'' کی شادی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھتیجے حضرت محمد بن جعفر بن ابی طالب نے ان سے (ام کلثوم سے) نکاح کرلیا، اور جب محمد بن جعفر کی بھی وفات ہوگئی تو ان کے بھائی عون بن جعفر نے اپنی زوجیت میں لے لیا، پھر ان ہی کے ہاں ان کا انتقال ہوا۔

ذوالجناحین حضرت جعفر بن ابی طالب کے لڑکے عبداللہ (رضی اللہ عنہما) نے اپنے ایک لڑکے کا نام ''ابوبکر'' رکھا، اور دوسرے صاحبزادے کا نام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نام پر ''معاویہ'' رکھا، اور عبداللہ ابن جعفر کے صاحبزادے معاویہ نے اپنے ایک بیٹے کا نام ''یزید'' رکھا، اس لیے کہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یزید نیک سیرت آدمی تھا[1] جیسا کہ اس کی شہادت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے محمد ابن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ نے دی ہے۔

(۱) شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ: یزید کے سلسلے میں لوگ تین گروہ میں بٹے ہوئے ہیں، دو گروہ انتہا پر ہیں اور ایک میانہ روی پر، انتہا پسند دو گروہوں میں سے ایک تو یہ کہتا ہے کہ یزید کافر منافق تھا، اور اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے انتقام لینے اور آسودگی حاصل کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کی کوشش کی۔

دوسرا انتہا پسند گروہ یہ کہتا ہے کہ وہ نیک آدمی اور عدل گستر حاکم تھا، اور ان صحابہ میں تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پیدا ہوئے۔=

ہم کیوں ان سے اظہار برأت کریں؟

شیعہ ہم سے جس تبرا کا مطالبہ کرتے ہیں، وہ اگر ہمارے اور ان کے درمیان قرب پیدا کرنے کی قیمت ہے جس کو وہ ہم سے وصول کرنا چاہتے ہیں، تو ان کے اولین امام حضرت علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) خطا کار ہوئے کہ انھوں نے اپنی اولاد کا نام ابوبکر، عمر اور عثمان رکھا، اور اس سے بڑی غلطی انھوں نے اپنی صاحبزادی کا عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکاح کر کے کیا، اور محمد ابن الحنفیہ بھی یزید کے حق میں شہادت دینے میں جھوٹے ثابت ہوں گے، جب کہ ان کے پاس حضرت عبداللہ بن زبیر کے قاصد عبداللہ بن مطیع (رضی اللہ عنہ) آئے، اور یہ کہا کہ یزید شراب پیتا ہے، نماز چھوڑتا ہے، اور قرآن کے حکم سے تجاوز کرتا ہے، تو حضرت محمد بن علی بن ابی طالب نے عبداللہ بن مطیع سے کہا (جیسا کہ البدایہ والنہایہ: ۸/۲۳۳ میں مذکور ہے) کہ ''میں نے تو اس کے اندر وہ باتیں نہیں پائیں جو تم لوگ کہہ رہے ہو، میں اس کے پاس گیا ہوں، اس کے پاس رہا ہوں، میں نے تو اس کو نماز کا پابند، خیر کا طلب گار، مسائل کو پوچھنے والا اور سنت کا التزام کرنے والا پایا ہے''۔ اس پر ابن مطیع اور ان کے ساتھیوں نے کہا کہ اس نے یہ سب کچھ آپ کو دکھانے کے لیے کیا ہے، تو حضرت محمد ابن الحنفیہ نے کہا کہ: اس کو مجھ سے کس بات کا خوف یا امید ہے کہ میرے سامنے خشوع ظاہر کرے؟ کیا اس نے تمھارے سامنے شراب پی ہے؟ اگر تمھارے سامنے پی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ تم بھی اس کے ساتھ شریک تھے، اور اگر تمھارے سامنے نہیں پی ہے تو تمھارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو تم جانتے نہیں اس کی گواہی دو۔ (ابن مطیع وغیرہ نے) کہا کہ اگرچہ ہم نے دیکھا نہیں ہے لیکن یہ بات ہمارے نزدیک سچ ہے، اس پر (ابن الحنفیہ نے) کہا کہ اللہ نے گواہی دینے والوں کو اس سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے (إِلَّا مَنْ شَهِدَ

= اور تیسرا قول یہ ہے کہ وہ مسلمان بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا، اس کے اندر اچھائیاں بھی تھیں اور برائیاں بھی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پیدا ہوا تھا، کافر نہیں تھا، ہاں اس کے سبب سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اور حرہ کا واقعہ پیش آیا، نہ وہ صحابی تھا اور نہ ہی اولیا میں سے تھا عام اہل علم وعقل اور اہل سنت والجماعت کا قول یہی ہے۔

اس کے بعد لوگ پھر تین گروہ میں تقسیم ہوگئے: ایک گروہ اس پر لعن کرتا ہے، دوسرا اس سے محبت رکھتا ہے، اور تیسرا نہ اس کو برا بھلا کہتا ہے، نہ اس سے محبت کرتا ہے، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے صراحۃً یہی (تیسرا) منقول ہے۔ اور حنبلی مسلک کے لوگ اور ان کے علاوہ تمام اعتدال پسند مسلمان اسی تیسرے طریقے پر گامزن ہیں۔

دیکھیے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا رسالہ ''سؤال في يزيد بن معاوية'' ص: ۲۵، تحقیق: دکتور صلاح الدین منجد (ناشر)

بِـالْـحَـقِّ وَهُـمْ يَـعْـلَمُوْنَ) ترجمہ: ہاں جن لوگوں نے حق بات یعنی کلمۂ ایمان کا اقرار کیا تھا اور وہ تصدیق بھی کیا کرتے تھے۔

اور مجھے تم سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔

اگر یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے کی یزید کے حق میں گواہی ہے، تو یہ کہاں سے ہوسکتا ہے کہ ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اور ان لوگوں کے بارے میں جن میں سے بعض حضرات حضرت علی سے اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ بہتر تھے، وہ موقف اختیار کریں جو شیعہ ہم سے چاہتے ہیں، یعنی حضرات ابوبکر، عثمان، طلحہ، زبیر اور عمرو بن العاص اور وہ تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جنھوں نے کتاب وسنت کی حفاظت کی، اور اس عالم اسلام کی تشکیل کی جس میں اور جس کی وجہ سے ہم سانس لیتے ہیں۔ درحقیقت شیعہ آپس کی قربت کے لیے ہم سے جس قیمت کا مطالبہ کرتے ہیں، وہ قیمت اتنی بھاری ہے کہ اس پر عمل کرکے ہم سب کچھ گنوادیں گے اور ہم کو حاصل کچھ نہیں ہوگا، اور بیوقوف ہے وہ شخص جو ایسے آدمی کے ساتھ لین دین کرے جو اس کے ساتھ دھوکے اور نقصان کا سودا کرے۔ درحقیقت وہ ولایت وبراءت جس پر مذہب شیعہ کی بنیاد کھڑی ہے، جیسا کہ نصیر طوسی نے ثابت کیا ہے اور نعمت اللہ موسوی وخونساری نے اس کی تائید کی ہے، اس کا معنی ومطلب مذہب اسلام کی تبدیلی اور جن کے شانوں پر اسلام کی عمارت استوار ہے ان سے دشمنی رکھنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

شیعہ اپنی اس بات میں جھوٹے ہیں کہ صرف ان ہی کا فرقہ ناجیہ (نجات پانے والا) ہے، جو کہ سب کا مخالف ہے۔

اسماعیلی فرقے کا امامیوں سے اختلاف

اسماعیلی فرقہ بھی امامیوں ہی کی طرح ہے، اور اسماعیلیوں کا بھی ان تمام امور میں مسلمانوں سے اختلاف ہے جن میں امامی شیعوں کا ہے سوائے ان چند لوگوں کی تعیین کے جن سے وہ موالات رکھتے ہیں۔ حضرت جعفر صادق تک امامی ان تمام لوگوں سے موالات رکھتے ہیں جن سے اسماعیلی رکھتے ہیں، حضرت جعفر صادق کے بعد دونوں کا راستہ الگ الگ ہوجاتا ہے، امامی فرقے کے لوگ حضرت موسی بن جعفر کو اور ان سے جو سلسلہ چلا ہے اس کو مانتے ہیں اور ان کی محبت کا دم بھرتے ہیں،

اور اسماعیلی فرقے والے حضرت اسماعیل بن جعفر کو اور ان سے جو سلسلہ چلا ہے اس کو مانتے ہیں، اسماعیل اور ان کے بعد والوں کے ساتھ اسماعیلیوں نے جو غلو کیا ہے اس پر امامیوں کو ان سے صفوی عہد سے حسد چلا آرہا ہے، چنانچہ اسماعیلی فرقہ مجلسی اور اس کے اعوان وانصار کے ہاتھوں اس حسد کا شکار ہوا ہے، گزشتہ ادوار میں ان کے غالی لوگ تعداد میں کم تھے، مگر اب بغیر کسی استثناء کے سب کے سب غالی ہوگئے ہیں، اور اس کا اعتراف جرح وتعدیل کے ان کے سب سے بڑے عالم (آیت اللہ مامقانی) نے ہر اس تذکرے میں کیا ہے جس کو اس نے پہلے کے غالی لوگوں کے بارے میں لکھا ہے، چنانچہ اس کی کتاب میں جہاں جہاں یہ موضوع زیر بحث آیا ہے وہاں اس نے کھل کر اس کا اظہار کیا ہے کہ جس بات کی وجہ سے پہلے کے غالی لوگ غالی سمجھے جاتے تھے آج وہ بات تمام امامی شیعوں کے ہاں ضروریات مذہب سے ہے، اس لیے وہ غلو جس کی وجہ سے اسماعیلی فرقہ امامی شیعوں سے جدا تھا اس میں اب وہ سب ایک ہوگئے ہیں، ان دونوں کے درمیان اس کے علاوہ کوئی فرق نہیں ہے کہ بعض شخصیات کو ایک فرقہ معبود سمجھتا ہے اور بعض دیگر کو دوسرا فرقہ، اور یہ سب ان لوگوں کو پیغمبر اسلام ﷺ کے مقام سے اوپر قرار دیتے ہیں، جن کی غیب سے متعلق بیان کی ہوئی باتوں کی تصدیق نہ کرنے کو محمد حسن اشتیانی کے بقول امامی فرقہ کے لوگ جائز سمجھتے ہیں، جیسے آنحضرت ﷺ نے آسمان وزمین کی تخلیق اور جنت وجہنم سے متعلق جو باتیں بیان فرمائیں ان کو نہ ماننا امامیوں کے نزدیک جائز ہے، جب کہ وہ اپنے ائمہ اور بارہویں خیالی امام کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جو ان کو یونان کے دیوتاؤں سے بھی آگے بڑھا دیتی ہیں۔

مسلمانوں کی جماعتوں اور شیعوں کے فرقوں کے درمیان نزدیکی کا محال ہونا تمام مسلمانوں سے اصول کے اندر ان کی مخالفت کی وجہ سے ہے جیسا کہ نصیر طوسی نے اس کا اقرار اور اعلان کیا ہے، اور نعمۃ اللہ موسوی وباقر خونساری نے اس کو برقرار رکھا ہے اور اس کو ہر شیعہ بھی تسلیم کرتا ہے، اور جب یہ چیز نصیر طوسی کے زمانے میں تھی تو باقر مجلسی سے لے کر اس وقت تک تو اور بھی زیادہ شدت اور سختی سے پائی جاتی ہے۔

(جاری ہے)

کشف الاستار کے جدید ایڈیشن کی سرگزشت

مسعود احمد الاعظمی

گزشتہ شمارے کے اداریے (حرف آغاز) میں حدیث شریف کی اسانید، اس کی اہمیت، اوران کی حفاظت وصیانت اوراشاعت کے سلسلے میں محدثین اورائمۂ حدیث کی بے مثال جدوجہد اور خدمات کوحوالۂ قلم کیا گیا تھا۔اس میں حدیث شریف کے ایک اہم مجموعے **کشف الأستار عن زوائد البزار علی الکتب الستة** کا ضمناً ذکر کرکے آئندہ شمارے میں تفصیلاً کچھ عرض کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے، جس کو پورا کرنا ہمارے اوپر قرض معلوم ہوتا ہے، اور بعض علم دوست اور کرم فرما ناظرین کی طرف سے اس کا تقاضا بھی ہے، ایفائے عہد کے طور پر اس سلسلے کی ضروری باتیں ناظرین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں۔

پانچویں صدی کے اواخر تک حدیث شریف کے بے شمار دواوین مرتب اور مدون ہوکر عالم اسلام کے دور دراز علاقے اوراس کے گوشے گوشے میں پھیل چکے تھے، عالم اسلام کے تقریبا تمام بڑے بڑے شہر علم کے مرکز بنے ہوئے تھے۔اس وقت کے بلاد وامصار میں کوئی ایسا شہر نہیں رہا ہوگا، جہاں علم کی مجلس نہ برپا ہو اوراہل علم وفضل وکمال، عروس علم کی مشاطگی اورحنا بندی نہ کررہے ہوں، علم کے مراکز اورمشہور ومعروف شہروں کی بات تو ایک طرف، چھوٹے چھوٹے قصبے اور بستیوں میں علم کی نہریں جاری تھیں۔یوں تو اہل علم وطلب کی توجہ کا مرکز علم ومعرفت کے تمام شعبے اورشاخیں تھیں، لیکن اس میں حدیث شریف کا حصہ دیگر تمام علوم سے زیادہ تھا، اوراس کے مختلف فنون محدثین اورائمۂ حدیث کے جولان گاہ بنے ہوئے تھے، اوراس کے ایک ایک فن پر مختلف انداز اور زاویوں سے داد تحقیق دی جارہی تھی۔

سندوں کے اہتمام کے ساتھ جب احادیث نبویہ مبارکہ کا بہت بڑا ذخیرہ تیار ہوگیا، اور احادیث وآثار حوادث روزگار اور دستبرد زمانہ سے پوری طرح محفوظ ہوگئے، اوراتنی بڑی تعداد میں

تصانیف وتالیفات اور دواوین حدیث معرض وجود میں آ گئے، کہ پیغمبر آخر الزماں ﷺ حتی کہ آپ کے صحابہ وتابعین کے اقوال وافعال، احوال وآثار، اور خدا کی آخری وابدی اسلامی شریعت کے تحفظ وبقا، ان میں کسی قسم کی ملاوٹ اور آمیزش یا جعل سازی کا خطرہ باقی نہیں رہا، تو تصنیف وتالیف کا ذوق رکھنے والے محدثین نے اپنی عنان توجہ ایسی کتابوں کی تصنیف کی جانب مبذول کی، جن میں افادیت کے ساتھ اختصار کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ایسی کتابیں تصنیف کی جائیں جو سندوں سے معرّیٰ اور خالی ہوں، اور سندوں کی کمی کی تلافی اس طرح پوری کر دی جائے کہ ان حدیثوں کے مآخذ کی طرف رہنمائی کر دی جائے۔ جیسے مشہور محدث اور حافظ حدیث حسین بن مسعود فراء بغوی -متوفی ۵۱۶- نے **مصابیح السنة** اور خطیب تبریزی -متوفی - نے **مشکوة المصابیح** میں کیا ہے۔ اور صرف ان ہی حضرات محدثین نے نہیں، بلکہ یہی کام تھوڑے مختلف انداز میں امام ابونصر حمیدی -متوفی ۴۸۸ھ-، علامہ ابن الاثیر جزری -متوفی ۶۰۶ھ- اور علامہ صغانی -متوفی ۶۵۰ھ- نے بھی بالترتیب **الجمع بین الصحیحین، جامع الأصول** اور **مشارق الأنوار** میں کیا ہے۔ ان حضرات کے بعد آنے والے محدثین کے دلوں میں ''زوائد'' کو جمع کرنے اور ان پر کتابیں تصنیف کرنے کا خیال پیدا ہوا، اور اس طریقے پر بہت سی کتابیں تصنیف وتالیف اور جمع وترتیب کے مشکل مراحل سے گزر کر معرض وجود میں آ گئیں۔

زوائد: سے مراد کسی خاص کتاب کی وہ حدیثیں ہیں جو دوسری کسی مخصوص یا متعین کتاب میں نہ پائی جاتی ہوں، اور اس قسم کی حدیثیں جس کتاب میں جمع اور درج کی جائیں، اس کو ''کتاب زوائد'' کہتے ہیں۔ دیکھیے دکتور محمود طحان اپنی کتاب **أصول التخریج ودراسة الأسانید** میں صفحہ ۱۱۹ پر لکھتے ہیں:

المقصود بالزوائد: المصنفات التی یجمع فیها مؤلفها الأحادیث الزائدة في بعض الکتب عن الأحادیث الموجودة في کتب أخری.

زوائد سے مراد وہ تصانیف ہیں جن کے اندر ان کا مؤلف کچھ کتابوں کی ایسی حدیثوں کو جمع کرتا ہے، جو دوسری کتابوں میں موجود حدیثوں سے زائد ہوتی ہیں۔

پھر انھوں نے اس مراد کو مثال سے واضح کیا ہے، اور لکھا ہے:

وتوضیح ذلک أنه لو قلنا إن کتاب ''زوائد ابن ماجه علی الأصول

الخمسة"، أي الكتاب الذي يشتمل على الأحاديث التي أخرجها ابن ماجه في سننه ولم يخرجها أصحاب الكتب الخمسة. أما الأحاديث التي شاركهم في إخراجها فلا يذكرها كتاب الزوائد هذا.

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم کسی کتاب کے بارے میں یہ کہیں کہ یہ "**زوائد ابن ماجه على الأصول الخمسة**" ہے، تو اس سے مراد ان حدیثوں پر مشتمل کتاب ہوگی، جن کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے، اوران کے علاوہ کتب ستہ کے باقی مصنفین (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی) نے ان حدیثوں کو اپنی کتابوں میں نہیں لیا ہے، رہیں وہ حدیثیں جن کو ابن ماجہ کے علاوہ ان میں سے کسی نے روایت کیا ہو، وہ کتاب زوائد میں درج نہیں ہوگی۔

کتب احادیث کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "زوائد" کے طرز پر کتابوں کی تصنیف کا داعیہ محدثین میں سب سے پہلے علامہ نورالدین علی بن ابی بکر ہیثمی -متوفی ۸۰۷ھ- یا ان کے استاذ وشیخ حافظ زین الدین ابوالفضل عبدالرحیم بن حسین عراقی -متوفی ۸۰۶ھ- کے قلب میں پیدا ہوا۔ کیونکہ "زوائد" کے موضوع پر کتابیں تو حافظ ہیثمی نے لکھیں، لیکن اس کام کے لیے ان کو تیار بظاہر ان کے استاذ حافظ عراقی نے کیا تھا، حافظ سخاوی نے الضوء اللامع (۱۷۹/۵) میں لکھا ہے:

"**وتخرج به في الحديث بل درّبه في إفراد زوائد كتب الخ**"

علامہ ہیثمی نے حافظ عراقی ہی کے پاس حدیث کی تحصیل کی، بلکہ عراقی ہی نے کتابوں کے زوائد کو الگ سے مرتب کرنے کی ان کی مشق اور تربیت کی۔

حافظ ابوالفضل عبدالرحیم عراقی -متوفی ۸۰۶ھ- اپنے وقت کے عظیم المرتبت عالم، جلیل القدر محدث، بلند پایہ مصنف اور باکمال مربی تھے، آٹھویں صدی کے اواخر اور نویں صدی کے اوائل کے بہت سے اہل علم ان کے فیض تربیت سے بہرہ مند ہوکر علم وفن اور تصنیف وتالیف کی بلندیوں تک پہنچے، حافظ سخاوی نے الضوء اللامع (۱۵۵/۴) میں اپنے استاذ ومربی حافظ ابن حجر عسقلانی -متوفی ۸۵۲ھ- کے حوالے سے لکھا ہے:

"**ولم نر في هذا الفن أتقن منه، وعليه تخرج غالب أهل عصره، ومن**

أخصهم به شيخنا صهره الهيثمي. وهو الذي درّبه وعلّمه كيفية التخريج والتصنيف".

ہم نے اس فن (علم حدیث) میں ان سے (عراقی سے) زیادہ باکمال نہیں دیکھا، ان کے بیشتر ہم عصروں نے ان ہی سے علم سیکھا اور تربیت پائی، ان کے تلامذہ میں سب سے خاص ہمارے استاذ اور ان کے (عراقی کے) داماد ہیثمی ہیں۔ عراقی ہی نے ہیثمی کی تربیت کی اور ان کو (احادیث کی) تخریج اور (کتابوں کی) تصنیف کا سلیقہ سکھایا۔

خود حافظ ابن حجر بھی حافظ عراقی کے دبستان علم حدیث کے فیض یافتہ اور ان کے خرمن کے خوشہ چینوں میں ہیں۔

حافظ عراقی کے شاگردوں نے زوائد کے جمع وترتیب پر خصوصی توجہ کی، اور انھوں نے اپنی محنت وکاوش سے ان احادیث نبویہ کا جو کتب ستہ میں نہیں ہیں، ایک نہایت مفید اور کارآمد ذخیرہ تیار کردیا۔ عراقی کے شاگردوں میں ایک شہاب الدین احمد بن ابی بکر بوصیری -متوفی ۸۴۰ھ- ہیں۔ جنھوں نے ''سنن ابن ماجہ'' اور امام بیہقی کی ''سنن کبریٰ'' کے زوائد کے علاوہ **إتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة** کے نام سے کتاب تصنیف کی، جس میں انھوں نے ابوداؤد طیالسی، مسدّد بن مسرہد، حمیدی، محمد بن یحییٰ بن ابی عمر، اسحاق بن راہویہ، ابوبکر بن ابی شیبہ، احمد بن منیع، عبد بن حمید، حارث بن ابی اسامہ اور ابویعلی موصلی کے مسانید کی ان حدیثوں کو جمع کیا جو کتب ستہ میں نہیں ہیں۔

بوصیری کے ہی معاصر مگر غالبًا ان سے پہلے زوائد کو جمع کرنے والے حافظ ابن حجر عسقلانی -متوفی ۸۵۲ھ- ہیں، حافظ ابن حجر کی تصانیف میں اس موضوع پر اہم ترین کتاب **المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية** ہے، **المطالب العالية** ان ہی مسانید کے زوائد کا مجموعہ ہے، جن کو بوصیری کی کتاب **إتحاف الخيرة** کے ذکر میں لکھا گیا ہے، حافظ ابن حجر کی اس کتاب کی دریافت، اس کی تحقیق اور تعلیقات وحواشی کے شہ پاروں سے آراستہ کرکے شائع کرنے کا سہرا ہمارے استاذ وشیخ خاتمۃ المحدثین، فخر الاماثل، محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے سر ہے، جن کی کئی برسوں کی شب وروز عرق ریزی اور جہد مسلسل کے بعد یہ کتاب اشاعت کے لائق ہوئی، اور ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۹۷۰ء میں چار جلدوں پر مشتمل کویت کی وزارت الاوقاف والشؤون الاسلامیہ کی

طرف سے اشاعت پذیر ہوئی۔

لیکن زوائد کی تصنیف اور ان کے جمع و ترتیب کی اولیت کی فضیلت جن کو حاصل ہے، وہ شہاب الدین بوصیری اور ابن حجر عسقلانی دونوں کے شیخ اور استاذ علی بن ابی بکر ہیثمی ہیں۔ جن کی اس موضوع پر متعدد بیش قیمت تصانیف یادگار ہیں، جن سے اہل علم مسلسل فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

حافظ ہیثمی:

اپنے وقت کے نہایت جلیل القدر اور عظیم المرتبت عالم اور نابغۂ روزگار محدث تھے، حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب **إنباء الغمر بأبناء العمر** (۲۵۶/۵) اور حافظ شمس الدین سخاوی -متوفی ۹۰۲ھ- نے **الضوء اللامع** (۱۷۹/۵) میں ان کا نام و نسب یوں لکھا ہے: **علی بن ابی بکر بن سلیمان بن أبی بکر بن عمر بن صالح الھیثمی** -نور الدین ان کا لقب اور ابوالحسن کنیت ہے۔ علمی دنیا میں نور الدین ہیثمی کے نام سے مشہور ہیں۔ ۷۳۵ھ میں مصر میں پیدا ہوئے، کم عمری ہی میں قرآن کریم حفظ کیا اور اس وقت کے محدثین کے سرخیل اور شیخ المشائخ حافظ حدیث زین الدین عراقی کے دامن تربیت سے وابستہ ہو گئے، استاذ کے ساتھ ان کا ایسا تعلق رہا کہ پوری زندگی ان کے آستانۂ فضل و کمال سے چمٹے رہے، حافظ عراقی کے علاوہ اس دور کے دوسرے مشائخ حدیث اور اہل علم سے کسب فیض کیا، لیکن حافظ عراقی کے دامن سے کبھی جدا نہیں ہوئے، حافظ ابن حجر جو نور الدین ہیثمی کے سب سے ممتاز اور مایہ ناز شاگرد ہیں، وہ اپنے شیخ ہیثمی کے حالات میں رقم طراز ہیں:

> **ثم رحل معه جميع رحلاته، وحج معه جميع حجاته، ولم يكن يفارقه حضراً ولاسفراً، وتزوج ابنته، وتخرج به في الحديث، وقرأ عليه أكثر تصانيفه، وكتب عنه جميع مجالس إملائه،** (إنباء الغمر: ۲۵۷/۵)
>
> ہیثمی ان کے (عراقی کے) تمام اسفار میں ان کے ساتھ رہے، ان کے ہر حج میں ساتھ ساتھ رہے، حضر ہو یا سفر کہیں ان سے جدا نہیں ہوئے، عراقی کی صاحبزادی سے ان کا نکاح ہوا، ان ہی سے حدیث کی تحصیل و تکمیل کی، عراقی کی اکثر کتابیں ان سے پڑھیں، ان کے املا کی تمام مجالس میں ان کے ارشادات فرمودات قلم بند کیے۔

حافظ ابن حجر نے اس کے بعد ان کے حسن اخلاق، بلندیٔ کردار، عادات و اطوار، تواضع

وانکسار، طبیعت ومزاج کی نرمی، قوت یادداشت اور استحضار کی تعریف کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ ان کو اپنے محاسن اور نمایاں اوصاف کی وجہ سے اپنے معاصرین خاص طور سے اپنے استاذ ہی کے شاگردوں کے ہاتھوں ایذارسانی اور آزار کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔

شعبان ۸۰۶ھ میں عراقی کے انتقال کے ایک سال بعد ہی ۲۹ رمضان ۸۰۷ھ کو نورالدین ہیثمی کی زندگی کا چراغ بھی گل ہوگیا، اوران کے جسد خاکی کو قاہرہ میں سپرد خاک کیا گیا۔

علامہ ہیثمی نے جن کتابوں کے زوائد کو الگ کرکے یکجا کیا، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱-**البدر المنير في زوائد المعجم الكبير**: اس میں انھوں نے امام طبرانی کی **المعجم الكبير** کے زوائد کو جمع اور مرتب کیا ہے۔

۲-**بغية الباحث في زوائد مسند الحارث**: اس میں مسند حارث بن ابی اسامہ کے زوائد کو جمع کیا ہے۔

۳-**غاية المقصد في زوائد المسند**: احادیث نبویہ کا عظیم الشان ذخیرہ **مسند الإمام أحمد بن حنبل** کے زوائد کے جمع وترتیب کا کام کیا ہے۔

۴-**كشف الأستار عن زوائد البزار**: اس مضمون میں جس کتاب کا تعارف مقصود ہے، مسند بزار یا **البحر الزخار** کے زوائد کو اس میں جمع کیا گیا ہے۔

۵-**مجمع البحرين في زوائد المعجمين**: امام طبرانی نے **المعجم** کے نام سے تین کتابیں تصنیف کی تھیں۔ **المعجم الكبير، المعجم الأوسط، المعجم الصغير. مجمع البحرين** میں علامہ ہیثمی نے اوسط اور صغیر کے زوائد کو شامل کیا ہے۔

۶-**المقصد العلي في زوائد أبي يعلى الموصلي**: اس کتاب میں انھوں نے مسند ابویعلی کے زوائد کو یکجا اور مرتب کیا ہے۔

۷-**موارد الظمآن إلى زوائد ابن حبان**: صحیح ابن حبان کے زوائد کو اس میں جمع کیا ہے۔

۸-**مجمع الزوائد ومنبع الفوائد**: زوائد کی سب سے مفید اور جامع کتاب ہے، امام ہیثمی نے مسند امام احمد، مسند ابویعلی، مسند بزار اور طبرانی کی معاجم ثلاثہ کی جو الگ الگ ترتیب دی تھی،

مجمع الزوائد کو ان سب کا مجموعہ بنا دیا۔ ان چھ کتابوں کی حدیثوں کی جو سندیں تھیں، اس میں شامل کرتے وقت ان سندوں کو حذف کر دیا اور صرف روایت کرنے والے صحابی کے نام کو باقی رکھا، اور جو حدیث جس باب کے تحت آتی تھی، اس باب کے ضمن میں اس کو ذکر کر کے اس کی سند کا صحیح، حسن یا ضعیف جو درجہ ہے، اس کو واضح کیا۔ فن حدیث کے لحاظ سے یہ نہایت مفید، نفع بخش اور کارآمد کتاب ہے، جو مصر اور دوسرے ممالک سے بار بار شائع ہو چکی ہے۔

حدیث کی جو کتابیں ''مسند'' کے طرز پر ہوتی ہیں، بہت سے زاویوں سے ان کتابوں سے فائدہ اٹھانا مشکل ہوتا ہے، مثلاً مسائل کے استنباط اور فقہی نقطۂ نظر سے ''مسانید'' سے استفادہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ کسی ''مسند'' کا یہ بہت بڑا فائدہ ہوتا ہے کہ ایک صحابی کی روایت کی ہوئی تمام حدیثیں ایک ہی جگہ مل جاتی ہیں، اور کم وبیش یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس مسند میں کس صحابی کی کتنی یا کون کون سی حدیثیں روایت کی گئی ہیں، لیکن کسی ''مسند'' میں کسی مسئلے سے متعلق کوئی روایت تلاش کرنا آسان کام نہیں ہے، علامہ ہیثمی کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے مذکورہ بالا کتابوں کے زوائد کے جو مجموعے تیار کیے ہیں، ان سب کو اس نہج پر مرتب کیا ہے، جو حدیث کی کتابوں میں ''جامع'' یا ''سنن'' کا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے فقہی نقطۂ نظر اور مسائل کے استنباط واستخراج کے لیے ان کتابوں کی طرف رجوع کرنا آسان ہو گیا ہے۔

علاوہ بریں ان کتابوں کو تصنیف کر کے علامہ ہیثمی نے علمی دنیا پر اس حیثیت سے بھی احسان کیا ہے کہ حدیث کی وہ کتابیں جو بعد میں حوادث روزگار کا شکار ہو گئیں، یا زمانے کی گردشوں میں پڑ کر ان کے ضائع ہو جانے کا امکان تھا، ان کی کم از کم وہ روایتیں محفوظ ہو گئیں، جن کو حافظ ہیثمی نے اپنی کتابوں میں شامل کر دیا۔

محدث جلیل حضرت علامہ الاعظمی رحمہ اللہ نے **کشف الأستار** کے اپنے مقدمے (**کلمة المحقق**) میں علامہ ہیثمی کی ان مبارک اور مخلصانہ کوششوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

فإن للإمام العلامة، الحافظ نورالدين علي بن أبي بكر الهيثمي منةً في رقاب علماء الحديث كافة، حيث يسَّر لهم العثور والاطلاع على ما لايوجد في الكتب الستة من الأحاديث النبوية وأوردها أئمة آخرون في دواوينهم، فعمد مثلاً

إلى صحيح ابن حبان، فأفرد زوائدها في مجلد سماه ''موارد الظمآن'' وأفرد زوائد أحمد، وأبي يعلى، والبزار، ومعاجم الطبراني الثلاثة في مؤلف كبير الحجم سمّاه شيخه العراقي ''مجمع الزوائد''، وأفرد لزوائد الحارث بن أبي أسامة مؤلفاً آخر، وأفرد زوائد المعجمين ''الأوسط'' و ''الكبير'' للطبراني في مؤلف على حدة.

امام وعلامہ، حافظ نورالدین علی بن ابی بکر ہیثمی کا تمام علماء کی گردنوں پر احسان ہے، کیونکہ انھوں نے علماء کے لیے ان حدیثوں کا مطالعہ اور ان سے استفادہ کا راستہ آسان کر دیا جو کتب ستہ میں نہیں ہیں، اور ان کو دوسرے ائمہ حدیث نے اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے، مثلاً انھوں نے صحیح ابن حبان کو منتخب کیا، اور اس کے زوائد کو الگ سے مرتب کیا جس کا نام انھوں نے موارد الظمآن رکھا، اور احمد، ابویعلی، بزار، طبرانی کی معاجم ثلاثہ کو ایک ضخیم کتاب میں جمع کیا جس کا نام ان کے استاد عراقی نے **مجمع الزوائد** رکھا، حارث ابن ابی اسامہ کے زوائد الگ کتاب میں جمع کیے، اور طبرانی کی معجم اوسط اور کبیر کو بھی الگ سے مرتب کرنے کا انھوں نے کارنامہ انجام دیا۔

ان ہی علامہ ہیثمی کی کاوشوں کا ثمرہ اور ایک خوبصورت مرقع **کشف الأستار عن زوائد البزار** ہے، جس کا تعارف ذیل کی سطروں میں پیش کیا جارہا ہے۔

''المآثر'' کے گزشتہ شمارے کے ''حرف آغاز'' میں یہ بتایا جاچکا ہے کہ ابوبکر بزار-متوفی ۲۹۲ھ- تیسری صدی ہجری کے ایک جلیل القدر اور ممتاز حافظ حدیث اور مصنف تھے، اور ان کی کتاب مسمی بہ ''المسند المعلل'' یا ''البحر الزخار'' دواوین حدیث میں ایک اہم مقام کی حامل کتاب ہے۔ امام بزار کی یہ کتاب چند برسوں پہلے تک نایاب اور اہل علم کی دسترس سے باہر تھی، اِدھر چند سال پہلے یہ کتاب متعدد جلدوں میں شائع ہوکر اصحاب علم کے دست شوق تک پہنچ چکی ہے، جب تک یہ شائع نہیں ہوئی تھی اس وقت تک یعنی تقریباً بیسوں برس تک بزار کی کتاب سے حتی المقدور فائدہ اٹھانے کا ذریعہ صرف **کشف الأستار** تھی، جو پہلی دفعہ ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء میں **مؤسسة الرسالة** بیروت سے چار جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔

کشف الأستار علم حدیث کے فنی نقطۂ نظر سے بھی ایک اہم کتاب ہے، کیونکہ اس کے مصنف نے کتب ستہ کے زوائد کو ابواب کی ترتیب پر جمع کرنے کے ساتھ اس بات کا اہتمام بھی کیا

ہے کہ امام بزار نے حدیث کی سندوں پر جو کلام کیا ہے اس کو بعینہ ان ہی کے الفاظ میں یا اس کا مفہوم نقل کیا ہے۔ کشف الأستار ایک نایاب کتاب تھی، عالم اسلام کے کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے بھی زیادہ تعداد میں نہیں تھے، ایسے گوہر نایاب کا سراغ لگا کر گوشۂ گمنامی سے باہر نکالنا اور اس کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق قابل اشاعت بنا کر علمی دنیا کے ہاتھوں تک پہنچانا کوئی آسان اور معمولی کام نہیں تھا، آج تو اس طرح کا کام بہت آسان ہوگیا ہے، لیکن نصف صدی پہلے وسائل کی قلت اور بے سروسامانی کی حالت میں یہ ایک نہایت مشکل کام تھا، توفیق الٰہی محدث جلیل حضرت علامہ اعظمی کے ساتھ تھی، اور ان کے ذوق جستجو اور جہد مسلسل نے اس مشکل کام کو آسان کر دکھایا۔ اہل علم کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ حضرت علامہ اعظمی ؒ علمی نوادر، خاص طور سے حدیث شریف کے مخطوطات اور قلمی نسخوں کے دل دادہ تھے، اور وہ اس طرح کی نایاب کتابوں کی دریافت اور دستیابی کے لیے ہمیشہ فکر مند رہا کرتے تھے، ان کو یہ فکر رہا کرتی تھی کہ حدیث پاک کی وہ کتابیں جو لوگوں کی دسترس سے باہر ہیں، اور ان تک اہل علم کی رسائی نہیں ہے، اور خوش بختی سے وہ حوادث زمانہ کے تصرفات سے بچ گئیں ہیں، اور ان کے اِکادُکا نسخے دنیا کے بعض بعض کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، ان کتابوں کو کسی طرح حاصل کر کے زیور طباعت سے آراستہ کیا جائے۔ یہ اس وقت اسلام کی ایک عظیم الشان خدمت ہے، اور اس میں احادیث نبویہ کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مستشرقین اور خاص طور سے منکرین حدیث کا نہایت مضبوط، مستحکم اور مثبت جواب بھی ہے۔

کشف الاستار کی تحقیق واشاعت حضرت محدث الاعظمی ؒ کی خدمت حدیث کے طلائی سلسلے کا ایک حلقۂ زریں ہے، یہ کتاب آپ کو کس طرح دریافت اور دستیاب ہوئی؟ اس کی نسبت آپ نے اس کی تحقیق کے بعد اس پر جو مقدمہ لکھا ہے، اس میں فرمایا ہے:

> **وقد عثرت صُدفةً على نسخة خطية من "كشف الأستار" في غاية الجودة، فعلِقَتُ بقلبي، وعلِقْتُ بها، وبذلتُ ما طلب صاحبها حتى اقتنيتُها.**

کشف الأستار کا ایک نہایت عمدہ قلمی نسخہ اتفاقاً مجھے دریافت ہوگیا، اس نے میرے دل کو موہ لیا، اور میں بھی اس کا شیفتہ ہوگیا، اور میں نے منھ مانگی قیمت دے کر اس کو حاصل کیا۔

مقدمے کی اس عبارت سے یہ عقدہ حل نہیں ہوتا کہ یہ نسخہ آپ نے کہاں دیکھا، اور آپ نے اس کو کتنی مشکل سے حاصل کیا، لیکن آپ کے بعض خطوط سے اس کی طرف رہنمائی ہوتی ہے، مجلس علمی ڈابھیل کے مالک مولانا ابراہیم میاں افریقی مقیم جوہانسبرگ ساؤتھ افریقہ کو ۱۸/ ذی قعدہ ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۲/ مارچ ۱۹۶۶ء کے ایک خط میں اس کتاب کی نسبت لکھا ہے:

''مکہ معظّمہ میں میں نے زبانی ذکر کیا تھا کہ جون پور کے ضلع میں ایک صاحب کے پاس سنن کبریٰ، نسائی کی دوسری جلد، اور ہیثمی کی زوائد مسند بزار، کا ایک نسخہ موجود ہے، سال بھر سے کوشش کر رہا ہوں کہ وہ ان دونوں کو ہمارے ہاتھ فروخت کردیں، پہلے تو وہ بہت زیادہ دام مانگ رہے تھے، مگر اب امید ہے کہ یہ دونوں چیزیں چھ سات سو روپے میں دے دیں گے۔

'زوائد مسند بزار'، کامل ہے، مگر 'سنن کبری' کا صرف نصف اخیر ہے''

پھر ۸/ جولائی ۱۹۶۶ء کے ایک خط میں مولانا ابراہیم میاں کو اس کی دستیابی کی خوش خبری سناتے ہوئے لکھا ہے:

''دونوں نسخے بہت ہی عمدہ اور تاریخی ہیں''

حضرت محدث الاعظمی ﷫ نے کشف الاستار کے مقدمے میں اس نسخے کا جو تعارف تحریر فرمایا ہے، اس کا اجمال یہ ہے کہ خوبصورت مشرقی خط نسخ میں لکھا ہوا یہ ایک تصحیح شدہ نسخہ ہے، جو اس کے مؤلف علامہ ہیثمی کے پاس پڑھا گیا ہے۔ بہت سے الفاظ پر نقطے لگائے گئے ہیں اور حرکت بھی ضبط کی گئی ہے، اس کے اوراق کی تعداد ۳۶۸ ہے، اس کا سائز ۱۹ سینٹی میٹر چوڑا اور ۲۶ ½ سینٹی میٹر لمبا ہے۔ یہ نسخہ متعدد حفاظ حدیث کے پاس بار بار پڑھا جا چکا ہے، اس کی ایک خاص اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی کے زیر مطالعہ رہ چکا ہے، اور بہت سے مقامات پر ان کے تحریر کردہ حواشی بھی موجود ہیں۔ اس کو ایک عالم و فاضل شخص علی بن احمد بن علی ادلبی نے ۸۰۷ھ میں مولف (علامہ ہیثمی) کی زندگی ہی میں لکھ کر تیار کیا تھا۔

باقی آئندہ

مدینہ منورہ میں مصلائے نبی (عیدگاہ) کا بیان

تحریر: جمال الدین محمد بن احمد المطری ترجمہ: مولانا انور رشید الاعظمی استاذ مرقاۃ العلوم، مئو

(ساتویں قسط)

ابراہیم بن ابی امیہ اور سن رسیدہ لوگوں میں سے ایک بزرگ سے منقول ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے سب سے پہلی عید کی نماز حارۂ دوس [1] میں ابن ابی الجنوب کے مکان کے پاس ادا فرمائی، اس کے بعد دوسری عید کی نماز دار جعفر کے پاس دار حکیم بن عدّاء کے صحن میں اس گھر کے اندر ادا فرمائی جس کے صحن میں مسجد ہے، پھر تیسری عید دار عبداللہ بن دُرہ مازنی کے پاس دار معاویہ اور دار کثیر بن الصلت نامی دو مکانوں کے اندر ادا فرمائی، پھر چوتھی عید کی نماز ان پتھروں کے پاس ادا فرمائی جو عیدگاہ میں گیہوں فروشوں کی یا غلہ فروشوں کی مارکیٹ کے پاس ہے، اس کے بعد محمد بن عبداللہ بن کثیر بن الصلت کے مکان میں ادا فرمائی، پھر وہاں ادا فرمائی جہاں اس وقت لوگ عید کی نماز پڑھتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عید الفطر یا عید الاضحیٰ کی پہلی نماز جو رسول اکرم ﷺ نے جماعت سے پڑھائی اصحاب محامل [2] کے پاس دار حکیم بن عدّاء کے صحن میں تھی۔ محمد بن عمار بن یاسر بھی روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ فسطاط [3] والوں کے قریب عظیم وکشادہ راستہ سے عیدگاہ کی طرف جاتے تھے، اور دار عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے قریب دوسرے راستہ سے واپس آتے تھے، عائشہ بنت سعد بن ابی وقاص بھی اپنے والد سے روایت کرتی ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ میری مسجد اور مصلی کے درمیان کا حصہ جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے۔

(۱) حارۂ دوس: متعین طور پر اس کا علم نہیں، البتہ ابن ابی الجنوب کے مکان کے پاس واقع ہونا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ وادی بطحان کے کنارے مصلی کے مغربی جانب ٹیلیفون آفس کے سامنے واقع ہے۔

(۲) اصحاب محامل: ہودج بنانے اور اس کی تجارت کا کام کرتے ہیں۔

(۳) خیمے اور بال اور اون سے بنے ہوئے فرش وغیرہ کی تجارت کرتے تھے عیدگاہ سے متصل جنوبی سمت میں مدینہ کے بازار کے آخری حصہ میں تھے، اس علاقہ کے اردگرد جو آج مسجد ابوبکر کے نام سے معروف ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قربانی کا جانور اپنے دست مبارک سے مصلی سے واپسی کے بعد اُس راستہ کے ایک کنارے پر ذبح فرماتے تھے جس راستہ سے واپس تشریف لاتے تھے، اور یہ راستہ اور وہ جگہ جہاں ذبح کرتے تھے مغرب کے مقابل بنی زُریق کے راستہ سے متصل ہے۔

میں کہتا ہوں کہ عظیم وکشادہ راستہ وہی اس وقت عام لوگوں کا راستہ ہے جو باب مدینہ سے عیدگاہ تک پہنچتا ہے، اور وہی ہے جس کا سطور بالا میں تذکرہ ہوا ہے ''پھر وہاں نماز ادا فرمائی جہاں آج کل لوگ عید کی نماز ادا کرتے ہیں'' اور نماز عید کی ادائیگی کے لیے جن مساجد کا اوپر کی سطور میں تذکرہ آیا ہے ہمیں اس مسجد کے علاوہ کسی اور مسجد کا علم نہیں جس میں اب تک نماز عید ادا کی جاتی ہو (مصنف کے دور کی طرف اشارہ ہے) اور وہی مشہور بھی ہے۔[1] اس کے شمال میں ایک مسجد ہے جو عُریض نام سے مشہور باغ کے وسط میں چاہِ ازرق کے گنبد سے متصل ہے، یہ باغ اسی کے پانی سے سیراب کیا جاتا ہے، اس وقت یہ مسجد، مسجد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نام سے معروف ہے، ممکن ہے کہ صدیق اکبر نے اپنے عہد خلافت میں اس مسجد میں نماز[2] ادا کی ہو۔ باغ کے شمالی جانب بھی ایک بڑی مسجد اس باغ سے متصل ہے جو مسجد علی بن ابی طالب کے نام سے موسوم ہے، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اپنے عہد خلافت میں مدینہ میں نماز عید پڑھنے سے متعلق کوئی روایت نہیں ملتی[3]، یہ تمام مسجدیں جو اب تک موجود ہیں اُن مقامات ومساجد میں سے ہیں جن میں یقینی طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سال بہ سال یکے بعد دیگرے نماز عید ادا فرمائی ہے، اس لیے کہ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ ابوبکر وعلی رضی اللہ عنہما اپنے واسطے مسجدیں مخصوص کرلیں اور وہ مسجد چھوڑ دیں جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی ہو۔

نقا[4] جس کا بعض اشعار میں تذکرہ ہے وہ عیدگاہ کے مغربی حصہ سے حج منزل تک وادی

---

(۱) یہ مسجد اس وقت مسجد غمامہ کے نام سے مشہور ہے، زمانۂ قریب تک اس میں جمعہ اور جماعت کا قیام ہوتا تھا، اس کے مشہور ائمہ میں ہمارے زمانہ میں (مصنف کا زمانہ) شیخ سیف یمانی تھے۔

(۲) یہ مسجد آج بھی اسی نام سے مشہور ہے سعودی حکومت میں ۱۴۱۲ھ میں اس کی تجدید ہوئی ہے۔

(۳) یہ مسجد آج بھی اسی مقام پر ہے اور اسی نام سے مشہور بھی، سعودی حکومت میں ۱۴۱۲ھ میں اس کی بھی تعمیر جدید ہوئی ہے۔

(۴) محدب ٹیلہ: عیدگاہ سے پچھّم ہے باب عنبریہ تک پھیلا ہوا ہے۔

بطحان کے مغرب میں ہے، یہ وادی، نقا اور عید گاہ کے درمیان حدّ فاصل ہے، ان دونوں جگہوں کے متصل اور قریب ہونے کی وجہ سے کسی شاعر نے شیب اور مصلّٰی الجنائز کا تذکرہ یوں کیا ہے۔

زندگی کے بے آب و گیاہ میدان میں راتوں کو سفر کرنے والے ہوشیار رہنا کہ دوران سفر سخت اور نرم زمین میں سفر کی تکالیف برداشت کروگے، تم نقا شیب سے تجاوز کر گئے اور نقا کے بعد مصلی ہی تو ہے۔

حاجز کا بھی اشعار میں تذکرہ ہے وہ نقا کے مغرب میں وادی عقیق کے سنگستانی علاقہ کے اخیر تک ہے، مدینہ منورہ کی مشہور مساجد میں مذکورہ مساجد کے علاوہ ایک مسجد تو ثنیۃ الوداع میں ہے جو ملک شام کے راستہ سے آنے والے کے بائیں جانب واقع ہے، اور ایک دوسری مسجد ہے جو بہت ہی چھوٹی ہے وہ نشیبی راستہ پر ہے اور وہ مشرقی راستہ ہے جو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مشہد مبارک تک ہے نشیبی باغات تک جانے والے کے بائیں ہاتھ پر ہے، اور مشہد حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاس کہا جاتا ہے کہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ (۱) کی مسجد ہے حالانکہ ان دونوں مسجدوں سے متعلق کوئی ایسی روایت نہیں ملی جس پر اعتماد کیا جائے۔ (واللہ اعلم)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کنویں

بئر اریس:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے منسوب کنوؤں میں سے بئر اریس ہے، یہ کنواں مسجد قباء کے مغرب میں اشراف اولاد علی رضی اللہ عنہ کے ایک بڑے باغ میں واقع ہے۔

سعید بن مسیّب کہتے ہیں کہ مجھے ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ انھوں نے اپنے مکان میں وضو کیا وضو سے فارغ ہوکر باہر نکلے اور کہا کہ میں آج کے دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہوں گا اور ان سے جدا نہیں ہوں گا، پھر وہ مسجد آئے اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لوگوں سے دریافت کیا، لوگوں نے بتایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکل کر اس سمت کو گئے ہیں، (ابوموسی کہتے ہیں) کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم کی اتباع کرتے ہوئے اور آپ کے بارے میں سوال کرتے ہوئے نکلا،

(۱) مسجد ابوذر غفاری ابھی تک مصنف کی متعین کردہ حدود کے اندر موجود ہے اور اسی نام سے اب تک موسوم ہے سعودی عہد حکومت میں اس کی تجدید بھی ہوگئی ہے۔

یہاں تک کہ آپ ﷺ بئر اریس کے پاس آئے مزید کہتے ہیں کہ میں باغ کے دروازہ کے پاس بیٹھ گیا، اس کا دروازہ کھجور کی ٹہنیوں سے بنا ہوا تھا، جب رسول اکرم ﷺ قضاء حاجت سے فارغ ہوئے اور وضو بھی کر لیا تو میں ان کی طرف اٹھ کر آیا تو دیکھا کہ آپ ﷺ بئر اریس کے چبوترے پر درمیان میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اپنی پنڈلیوں کو کھول کر کنویں میں لٹکا رکھا ہے، کہتے ہیں کہ میں نے آپ کو سلام کیا پھر واپس دروازہ کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور میں نے کہا کہ آج میں رسول اکرم ﷺ کی دربانی کروں گا، کچھ دیر بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور دروازہ کھٹکھٹایا تو میں نے پوچھا کہ کون؟ انھوں نے جواب دیا کہ ابوبکر، میں نے کہا کہ آہستہ و باوقار رہئے، کہتے ہیں کہ میں گیا اور رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اجازت چاہتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ انھیں اجازت دے دو اور جنت کی بشارت بھی سنا دو، کہتے ہیں کہ میں آیا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ تشریف لائیں رسول اللہ ﷺ آپ کو جنت کی بشارت دے رہے ہیں، کہتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ داخل ہوئے اور رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ کنویں کے چبوترے پر آپ ﷺ کے دائیں جانب بیٹھ گئے اور اپنے پاؤں کنویں میں لٹکا لیے جس طرح نبی اکرم ﷺ نے لٹکایا تھا اور اپنی پنڈلیاں بھی کھول دیں۔ پھر میں واپس آیا اور بیٹھ گیا، اور اپنے بھائی (ابوبکر رضی اللہ عنہ) کو چھوڑ دیا کہ وضو کر لیں اور وضو سے فارغ ہو کر میرے پاس آ جائیں، پھر میں نے کہا کہ اگر اللہ رب العزت کو فلاں شخص کے ساتھ خیر منظور ہوگا تو اس کو لائے گا، یکا یک دیکھا کہ کوئی شخص دروازہ کو حرکت دے رہا ہے، میں نے پوچھا کہ کون؟ اس شخص نے جواب دیا کہ عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) میں نے کہا کہ ذرا باوقار رہئے، پھر میں نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور انھیں سلام کرنے کے بعد عرض کیا کہ عمر آئے ہیں اور اجازت چاہتے ہیں آپ نے فرمایا کہ ان کو اجازت دے دو اور جنت کی بشارت بھی سنا دو، میں عمر کے پاس آیا اور کہا کہ داخل ہو جائیں اور نبئ اکرم ﷺ آپ کو جنت کی خوشخبری بھی دے رہے ہیں، راوی کہتے ہیں کہ عمر آئے اور رسول اکرم ﷺ کے ساتھ آپ کے پاس بائیں جانب چبوترے پر بیٹھ گئے اور اپنے پیروں کو کنویں میں لٹکا لیا، پھر میں لوٹ آیا اور بیٹھ گیا اور جی میں کہا کہ اگر اللہ رب العزت کو فلاں کے ساتھ (ان کے دینی بھائی) خیر منظور ہوگا تو انھیں لائے گا، اس کے بعد ایک شخص آئے اور دروازہ کو حرکت دیا تو میں نے سوال کیا کہ کون ہے؟ انھوں نے جواب میں عثمان بن عفان کہا، میں نے کہا

کہ ذرا باوقار رہئے، اور نبیٔ اکرم ﷺ کے پاس آ کر ان کو خبر دی، آپ نے فرمایا کہ ان کو بھی اجازت دے دو اور جنت کی خوشخبری بھی دے دو، لیکن انھیں ابتلاء وآزمائش سے بھی گذرنا ہوگا، میں آیا اور میں نے کہا کہ اندر آجائیں نبیٔ اکرم ﷺ جنت کی بشارت دے رہے ہیں لیکن آپ کو ابتلاء وآزمائش سے بھی دوچار ہونا پڑے گا، راوی کہتے ہیں کہ حضرت عثمان اندر آئے، تو دیکھا کہ کنویں کا چبوترہ پُر ہو چکا ہے (جگہ نہیں ہے) اس لیے آپ دوسری جانب ان حضرات کے بالمقابل بیٹھ گئے، شُریک (حدیث کے ایک راوی) کہتے ہیں کہ سعید بن المسیب کہتے ہیں کہ میں نے اس کی تاویل یہ کی کہ ان کی قبریں بھی اسی طرح ہوں گی۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی انگوٹھی (ان کی حیات میں) ان کے دست مبارک میں تھی، اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں، پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا عہد آیا آپ بئر اریس پر بیٹھ کر انگوٹھی نکال کر اس سے کھیلنے لگے جس کے نتیجہ میں انگوٹھی کنویں میں گر گئی، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ تین روز تک آتے جاتے اور تلاش کرتے رہے پورے کنویں کا پانی بھی نکالا گیا مگر وہ انگوٹھی نہیں ملی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ (انگوٹھی کھونے کا واقعہ) آپ کی خلافت کے چھ سال مکمل ہونے پر پیش آیا اور اسی روز سے آپ کی خلافت میں اختلافات کا دور شروع ہوا، آپ کی خاتم مبارک کے کھونے سے وہ برکت جاتی رہی، واللہ اعلم، (یہ صحیح نہیں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اختلاف کا سبب مذکورہ واقعہ تھا (انگوٹھی کے گم ہونے کا) جس کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے، اہل علم میں سے کسی نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا، انگوٹھی کا گم ہونا ترقی وتنزلی یا نفع ونقصان کسی چیز کا بھی سبب نہیں۔

شیخ ابن نجار کہتے ہیں کہ میں نے اس کنویں کے طول کی پیائش کی تو ۱۴ ہاتھ ایک بالشت تھی، جس میں ڈھائی ہاتھ پانی تھا، اس کا عرض ۵ ہاتھ تھا، اور اس کے چبوترہ کا طول جس پر رسول اکرم ﷺ اور آپ کے دونوں اصحاب بیٹھے تھے، تین ہاتھ سے ایک ہتھیلی کے بقدر کم تھا۔

میں کہتا ہوں کہ وہ مدینہ کے جانب قبلہ بلند قلعوں میں ایک قلعہ کے نیچے تھا، جس کے اوپری حصہ میں ایک مکان تھا جس میں باغ کانگراں اور مسجد قباء کا خادم رہتا تھا، اس کے آس پاس

انصار کے مکانات اوران کے آثار تھے، شیخ صفی الدین ابوبکر بن احمد سلامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تجدید کی اور سیڑھیاں بنائیں تاکہ پینے والے یا وضوکرنے والے اس کے ذریعہ اتر سکیں، سیڑھیوں کے اوپر گنبد نما گول کمرہ بھی ہے، اس کی تعمیر ۷۱۴ھ میں کی تھی، (بئر اریس کے بارے میں سمہودی کا بیان ہے کہ اس کی نسبت ایک یہودی کی طرف ہے جس کا نام اریس تھا جس کے معنی فلاح وکامیابی کے ہیں، ان کا یہ بھی بیان ہے کہ ان کے عہد میں اس کا طول ۱۹ ہاتھ تھا، اور پانی کی گہرائی ۴ ہاتھ تھی، اور یہ ابھی تک معلوم ہے کہ مسجد قباء کے مغربی دروازہ کے قریب واقع ہے، مگر مسجد قباء کی تعمیر وتوسیع جدید اس کے اوپر ہوگئی، مدینہ منورہ کے بعض مورخین ومحدثین مثلاً شیخ عبدالقدوس انصاری نے اس کی تصویر لی ہے۔

بئر غُرس:

سعید بن عبدالرحمٰن بن رقیش کہتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ قباء میں ہمارے پاس آئے اور کہا کہ تمھارا یہ کنواں بئر غرس کہاں ہے؟ ہم نے آپ کو وہ جگہ بتادی، پھر آپ نے کہا کہ میں نے نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ بوقت سحر گدھے پر سوار ہوکر اس کنویں کے پاس آئے، کنویں کا پانی بلند ہو رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ڈول پانی منگوایا اور اس سے وضو کیا پھر وہ پانی اسی کنویں میں بہادیا، (آپ کی برکت کی وجہ سے) پھر کنویں کا پانی گہرائی میں نہیں گیا۔

ابراہیم بن اسماعیل بن مجمع کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں نے اس حال میں صبح کی کہ جنت کے ایک کنویں پر تھا، آپ نے بئر غرس پر صبح کی، چنانچہ آپ نے اس پانی سے وضوفرمایا اور لعاب دہن میں اس میں ڈال دیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت اسی کنویں کے پانی سے آپ کو غسل دیا گیا، شیخ محبّ الدین کہتے ہیں کہ اس کنویں اور مسجد قباء کے درمیان نصف میل کا فاصلہ ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ کنواں مسجد قباء کے شمال مشرق میں تھا، اور وہ کھجور کے درختوں کے درمیان میں تھا، اس وقت (مولف کا زمانہ) وہ جگہ اور اس کے آس پاس کا علاقہ مَغْرَس کے نام سے معروف ہے، اور اب وہ اہل مدینہ میں سے کسی کی ملکیت ہے، وہ ویران ہوگیا تھا ۸۸۰ھ کے بعد از سرنو تعمیر کیا گیا تھا، اس میں پانی بکثرت تھا، اس کا عرض دس ہاتھ، اور طول اس سے زیادہ تھا، اکثر پانی پر سبز رنگ کا غلبہ تھا، بڑا لذیذ اور شیریں تھا۔

بئر بُصّہ:

حضرت ربیع بن عبدالرحمٰن بن ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شہداء اور ان کے فرزندوں کے پاس تشریف لاتے تھے اور ان کے اہل وعیال اور جانوروں کے چارہ وغیرہ کی نگہبانی بھی فرماتے تھے، ایک روز ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے تو فرمایا کہ کیا تمھارے پاس بیری کے پتے ہیں جن سے اپنا سر دھوؤں کیونکہ آج جمعہ کا دن ہے، حضرت ابوسعید خدری نے جواب میں عرض کیا کہ ہاں ہے، اور آپ کی خدمت میں اس کو حاضر کردیا، اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بئر بُصّہ تک گئے، وہاں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سر مبارک دھویا اور سر اور بالوں کا باقی ماندہ پانی بئر بُصّہ کے اندر ڈال دیا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ کنواں بقیع سے قریب، قباء کے رخ پر چلنے والے کے بائیں جانب واقع ہے، وہ ایک بڑے باغ میں ہے جس کی احاطہ بندی کی گئی ہے، اس کے قریب ہی باغ کے اندر اس سے چھوٹا ایک دوسرا کنواں بھی ہے، ان دونوں کے بارے میں لوگوں کی مختلف رائیں ہیں کہ ان میں بئر بُصّہ کون ہے؟ مگر شیخ ابن نجار رحمۃ اللہ علیہ کا قطعی فیصلہ ہے کہ وہ بڑا قبلہ کی سمت والا ہے، اور مزید کہتے ہیں کہ اس کا عرض ۹ ہاتھ اور طول ۱۱ ہاتھ ہے، اور چھوٹے کا عرض ٦ ہاتھ ہے اور وہ وہی ہے جو مشرقی قلعہ سے متصل ہے یہ قلعہ ابوسعید خدری کے والد مالک بن سنان کی ملکیت ہے، اور میں نے اہل مدینہ میں سے بعض اُن لوگوں سے جو حرم شریف کے اکابر خدام میں شمار ہوتے ہیں یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ بڑا کنواں ہے جو قبلہ کی سمت میں واقع ہے، اور نمونۂ سلف فقیہ صالح ابوالعباس احمد بن موسیٰ بن عجیل رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر صلحاء یمن جب اس کنویں سے تبرک حاصل کرنے کے قصد سے آتے تو اس بڑے کنویں کا قصد کرتے جو جانب قبلہ ہے، اور باغ جس میں اس وقت وہ کنواں موجود ہے وہ فقراء ومساکین اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے واردین وصادرین کے لیے وقف ہے، جس کو عزیز الدولہ شیخ ریحان بدری شہابی نے وقف کیا تھا وفات سے دو یا تین سال قبل تک حرم شریف کے بڑے خدام میں شمار کیے جاتے تھے، ۶۹۷ھ میں وفات ہوئی۔ (۱)

(۱) بئر بُصّہ: باء کے ضمہ اور صاد کی تشدید اور فتحہ کے ساتھ، عہد قریب تک مشہور تھا، جانب حرم سے عوالی کے دائیں جانب بقیع کے جنوب میں واقع تھا اور بئر بوصہ سے پہچانا جاتا تھا، اب اس کا وجود نہیں، شاید وہاں وقف شدہ عمارت سے اس کا اشارہ ملتا ہے تاریخ معالم المدینہ ص ۱۸۸۔

بئر حاء:

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ انصار مدینہ کے مالدارترین لوگوں میں سے تھے، کھجور کے کافی درخت تھے، ان کا سب سے محبوب مال بئر حاء تھا، جو مسجد کے سامنے تھا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تشریف لاتے تھے اور اس کا لذیذ پانی نوش فرماتے تھے، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آیۃ کریمہ **لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ**، نازل ہوئی تو ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ** (۱)، میرے نزدیک سب سے محبوب مال بئر حاء ہے، وہ اللہ کی راہ میں صدقہ ہے، اللہ سے اس کے ثواب کی امید رکھتا ہوں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو میرے لیے ذخیرۂ آخرت بنادے، اس لیے اے اللہ کے رسول آپ جہاں مناسب خیال فرمائیں وہاں اس کو استعمال کریں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شاباش یہ نفع بخش مال ہے، مفید مال ہے، تم نے جو کچھ کہا وہ میں نے سن لیا، میری رائے یہ ہے کہ تم اسے اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کردو، ابوطلحہ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ایسا ہی کروں گا، پھر ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے قرابت داروں اور چچا کے لڑکوں میں تقسیم کردیا۔ (۲)

میں کہتا ہوں کہ یہ کنواں ایک چھوٹے باغ کے وسط میں واقع ہے جس میں عمدہ کھجوروں کے درخت ہیں یہ کنواں مدینہ منورہ کی فصیل کے شمال میں واقع ہے، اس کے اور فصیل کے درمیان راستہ ہے، یہ آج کل (۳) نوریہ کے نام سے مشہور ہے، بعض نوری عورتوں نے اس کو خرید کر فقراء و مساکین اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے واردین وصادرین کے لیے وقف کردیا، روایتوں میں آتا ہے کہ وہ مسجد کے بالمقابل ہے۔

شیخ محبّ الدین بن نجار کہتے ہیں کہ میں نے اس کی پیمائش کی تو معلوم ہوا کہ اس کا طول ۲۰ ہاتھ ہے جس میں ۱۱ ہاتھ پانی ہے اور باقی بغیر پانی کے تعمیر والا حصہ ہے، البتہ اس کا عرض ۳ ہاتھ سے

---

(۱) آل عمران ۹۲۔

(۲) بخاری ۸۱۴/۲

(۳) مصنف کے عہد کی طرف اشارہ ہے ورنہ آج کل بے نام ونشان ہے حرم کے آس پاس کے علاقہ کی منصوبہ بندی کے وقت اس کا نام ونشان ختم ہوگیا اور وہاں جدید شاہراہیں کھل گئیں۔

کچھ زیادہ ہے[(۱)]۔

بئر بُضاعہ:

محمد بن ابی یحییٰ اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتی ہیں کہ میں چند عورتوں کے ساتھ سہل بن سعد کے پاس آئی تو انھوں نے کہا کہ اگر میں تم لوگوں کو بئر بُضاعہ کا پانی پلاؤں تو تم کو کراہت ہوگی اور پسند نہ کروگی، اور بخدا میں نے رسول اکرم ﷺ کو اپنے ہاتھ سے اس کا پانی پلایا ہے۔

ابوداؤد[(۲)] نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے سنا کہ رسول اکرم ﷺ سے لوگ کہہ رہے تھے کہ آپ کو بئر بُضاعہ کا پانی پلایا جاتا ہے حالانکہ اس کنویں میں کتوں کے گوشت، ایام حیض کے چیتھڑے، اور لوگوں کی نجاستیں ڈالی جاتی ہیں، تو جواب میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ پانی پاک ہوتا ہے اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی[(۳)]۔

مالک بن حمزہ بن ابواسید اپنے والد سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے بئر بُضاعہ کے لیے دعا فرمائی تھی۔

عبدالمہیمن بن عباس بن سہل بن سعد اپنے والد سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بئر بُضاعہ کے اندر اپنا لعاب مبارک ڈالا تھا۔

ابوداؤد سجستانی نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے کہ میں نے قتیبہ بن سعید کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے بئر بضاعہ کے نگران سے اس کی گہرائی کے متعلق سوال کیا تھا، تو انھوں نے بتایا کہ عموماً اس میں پانی ناف تک ہوتا تھا، میں نے پوچھا کہ کم ہونے پر کتنا ہوتا تھا؟ انھوں نے کہا کہ شرمگاہ سے نیچے تک، ابوداؤد کہتے ہیں کہ میں نے بئر بُضاعہ کا اندازہ کرنے کے لیے اپنی چادر کو اس پر پھیلایا پھر اس کی پیمائش کی تو اس کا عرض ۶ ہاتھ تھا، اور میں نے اس شخص سے جس نے باغ کا دروازہ کھول کر مجھے اندر

(۱) بئر حاء: نام اور رسم کے بارے میں اختلاف ہے، بعض لوگ کسی مرد یا عورت کی طرف منسوب کرتے ہیں جو قدیم زمانہ میں تھے، بعض کی رائے ہے کہ مرکب نام ہے، بعض کا کہنا ہے کہ وہ مضاف اور مضاف الیہ سے مرکب ہے، حاء کے بارے میں اختلاف ہے کہ قصر ہے یا مد ہے، متعدد نے اس کو ترجیح دیا ہے کہ حرف معجم کے لفظ سے ہے یعنی حاء ممدودہ سے، (سمہودی ۳/ ۵۶۱-۵۶۵) مصنف کے بیان کے مطابق مسجد نبوی کے شمال میں مدینہ کی فصیل سے تھوڑے فاصلہ پر ہے، بعض محدثین کو چودہویں صدی ہجری کے آخر میں اس کے بارے میں علم ہوا تھا، مگر حرم کی جدید توسیع کے وقت اس کے نشانات ختم ہوگئے، (آثار المدینہ ص ۲۴۸، عبدالقدوس انصاری)

(۲) ابوداؤد ۱/ ۱۷، ۱۸ (۳) ترمذی ۱/ ۹۵

داخل کیا یہ پوچھا کہ کیا اس کی سابقہ تعمیر میں ترمیم کی گئی ہے؟ تو اس نے کہا کہ نہیں (کوئی تغیر نہیں ہوا)

میں کہتا ہوں کہ یہ کنواں اس وقت مدینہ کی فصیل کے شمال میں ایک باغ کے کنارے ہے اور بئر حاء کے مغرب میں جانب شمال ہے، اس سے اس باغ والے جو کنویں کے سامنے ہے پانی حاصل کرتے ہیں اور دوسرے کنویں والے بھی جو کنویں کے شمال میں ہے، پانی حاصل کرتے ہیں، اور کنواں ان دونوں کے درمیان میں ہے، کنویں کا پانی بڑا لذیذ وشیریں ہے، شیخ محبّ الدین کہتے ہیں کہ میں نے اس کی پیمائش کی تو اس کا طول ۱۱ ہاتھ ایک بالشت تھا، جس میں ۲ ہاتھ پانی اور باقی تعمیر والا حصہ تھا، اور عرض ۶ ہاتھ تھا ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی پیمائش ذکر کی ہے۔

بئر رومہ:

ابوعبدالرحمٰن سلمی سے روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جس وقت محاصرہ کیا گیا تو لوگوں کی طرف جھانک کر کہا کہ میں تم کو اللہ کی قسم دیتا ہوں اور صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو قسم دیتا ہوں کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص بئر رومہ کھودے گا تو اس کے لیے جنت کی خوشخبری ہے، تو میں اسے کھودا ہے، اور کیا تم لوگ یہ نہیں جانتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جس شخص نے جیشِ عسرت [1] کے لیے سامان فراہم کیا تو اس کے لیے جنت (کی خوشخبری) ہے تو میں نے اس کے لیے سامان فراہم کیا ہے، عثمان کہتے ہیں کہ لوگوں نے میری اس بات کی تصدیق کی۔

ابوعبداللہ محمد بن محمود بن محاسن کہتے ہیں کہ عفیفہ اصفہانی نے مجھے یہ تحریر لکھی کہ ابوعلی حداد نے ان کو بذریعہ خط ابونعیم کے بارے میں یہ اطلاع دی کہ ابونعیم کہتے ہیں کہ جعفر خلدی نے ان کو لکھا کہ ابویزید مخزومی نے ان کو خبر دی، اور انھیں زبیر بن بکار نے ان کو محمد بن حسن نے ان کو محمد بن طلحہ نے ان کو اسحاق بن یحییٰ نے انھیں موسی بن طلحہ نے یہ بتایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ حفیرۂ مزنی کتنا اچھا گڈھا ہے، آپ کی مراد بئر رومہ ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب آپ کا ارشاد سنا تو ۱۰۰/ اونٹ کے عوض اس کا نصف حصہ خرید کر صدقہ کردیا، لوگ اس سے پانی لینے لگے اور پینے کا کام لینے لگے، کنویں کے مالک نے جب دیکھا کہ اس کو اس کنویں سے پانی لینے میں رکاوٹ پیدا ہورہی ہے تو نصف باقی کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو معمولی قیمت کے عوض فروخت کردیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو بھی صدقہ کردیا۔

---

(۱) جیش عسرت: غزوۂ تبوک کا لشکر، یہ غزوہ س ۹ ھ میں ہوا، تبوک ایک مقام ہے جو مدینہ منورہ سے جانب شمال ۷۲۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔

ابوعمر بن عبدالبر کہتے ہیں کہ بئر رومہ ایک یہودی کی ملک میں آبی کنواں تھا، مسلمان اس کا پانی خریدتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص بئر رومہ کو خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کردے، اپنا ڈول ان کے ڈول میں شامل کردے تو اس کے لیے اس کے عوض جنت میں پانی کا کنواں ہوگا[1]۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس یہودی کے پاس آئے اور اس سے اس کا سودا کیا اس نے مکمل کنواں بیچنے سے انکار کیا، آپ نے نصف کنواں ۱۲ ہزار درہم میں خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کردیا، یہودی نے حضرت عثمان سے کہا کہ تم چاہو تو اپنے حصہ میں دو نشانات (امتیاز پیدا کرنے کے لیے) لگادوں، یا پھر باری مقرر کرلیں، ایک دن میری باری رہے دوسرے دن آپ کی، حضرت عثمان نے باری والی رائے کو پسند فرمایا، حضرت عثمان کی جس دن باری ہوتی تو مسلمان اتنا پانی لے لیتے جو دو دنوں کے لیے کفایت کرتا، یہودی نے جب یہ صورتحال دیکھی تو کہا کہ آپ نے میرا کنواں خراب کردیا، اس لیے بقیہ نصف حصہ بھی خریدلو، آپ نے اس حصہ کو بھی آٹھ ہزار درہم میں خریدلیا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ کنواں وادی عقیق کے درمیان کشادہ زمین کے نشیبی حصہ میں واقع ہے اور اس کے پاس پتھر اور گچ کی بنی ہوئی اونچی عمارت ہے جو منہدم ہوچکی ہے، کہا جاتا ہے کہ وہ کسی یہودی کا معبد ہے، جو مسجد قبلتین کے شمال میں واقع ہے، فاصلہ پر ہے اور اس کے پاس کنوؤں کی کثرت ہے، اور کھیت بھی ہیں، اور وہ مدینہ کے مشہور مقام جُرف کے سامنے ہے جو ویران ہے اس کے پتھر ٹوٹ گئے ہیں اور لوگوں نے اس کو پاٹ دیا ہے صرف اس کا نشان باقی ہے۔

شیخ محبّ الدین بن نجار کہتے ہیں کہ میں بئر رومہ سے واقف ہوں اس کا مَن ٹوٹ گیا اس کے نشانات بھی مٹ گئے البتہ وہ بہت عمدہ کنواں تھا، بڑے عمدہ پتھروں سے بنایا گیا تھا، میں نے اس کی پیمائش کی تو اس کا طول ۱۸ ہاتھ بشمول ۲ ہاتھ پانی کے، باقی حصہ میں ریت بھری ہوئی تھی جس کو ہوا اڑا کر لاتی تھی، اس کا عرض ۸ ہاتھ تھا، پانی انتہائی شیریں اور عمدہ پاک وصاف، مزید کہتے ہیں کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ مذکورہ بالا کنویں ایسے ہیں کہ ان کا پانی بعض دنوں میں زیادہ ہوجاتا ہے، اور پھر کم ہوجاتا ہے کبھی کبھی تو ریت بھرا ہوا حصہ ہی باقی رہتا ہے۔

(جاری ہے)

---

(۱) صحیح بخاری ج ۵ ص ۲۹

’’آنحضرت ﷺ اور قبیلۂ بنی نجار‘‘

ڈاکٹر عبدالمعید صاحب، کھیری باغ روڈ، مئو

ہاشم آنحضرت ﷺ کے پردادا تھے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہاشم کا نام عمرو تھا۔ مکہ میں قحط تھا، ہاشم نے شوربہ میں روٹیاں چور کر اہل مکہ کو کھلائیں، اس لیے ان کا نام ہاشم ہوگیا۔ ہشم کے معنی چورہ کرنے کے ہیں، ہاشم اُسی کا اسم فاعل ہے۔

عمرو العلا هشم الثريد لقومه

ورجال مكة مُسنتون عجاف

’’عمرو بلند مرتبہ نے اپنی قوم اور تمام اہل مکہ کو ثرید بنا کر کھلایا اور مکہ کے لوگ قحط کی وجہ سے لاغر اور ناتواں تھے‘‘۔

ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار اہل مکہ کو اس طرح سے کھلایا۔ نہایت سخی تھے۔ دسترخوان بہت وسیع تھا۔ ہر وارد و صادر کے لیے ان کا دسترخوان حاضر تھا۔ غریب مسافروں کو سفر کرنے کے لیے اونٹ عطا فرماتے تھے۔ نہایت حسین وجمیل تھے۔ نور نبوت آپ کی پیشانی پر چمکتا تھا۔ علماء بنی اسرائیل جب آپ کو دیکھتے تو سجدہ کرتے اور آپ کو ہاتھوں کو بوسہ دیتے۔

قبائل عرب اور علماء بنی اسرائیل نکاح کے لیے اپنی لڑکیاں ہاشم پر پیش کرتے تھے، حتی کہ ایک مرتبہ ہرقل شاہ روم نے ہاشم کو خط لکھا کہ مجھ کو آپ کے جود وکرم کی اطلاع پہنچی ہے، میں اپنی شہزادی کو، جو حسن وجمال میں یگانۂ روزگار ہے، آپ کی زوجیت میں دینا چاہتا ہوں۔ آپ یہاں آجائیں تاکہ آپ سے شہزادی کا نکاح کردوں۔ ہاشم نے شہزادی کے نکاح سے انکار کردیا۔ شاہ روم کا مقصد اصلی یہ تھا کہ وہ نور نبوت جو ہاشم کی پیشانی پر چمک رہا ہے اس کو اپنے گھرانے میں منتقل کرلے۔ کہا جاتا ہے کہ وفات کے وقت ہاشم کا سن ۲۵ سال کا تھا۔

(سیرۃ المصطفیٰ ﷺ جلد اول ص ۳۰، بحوالہ زرقانی جلد ۱ ص ۷۲)

ہاشم ہی نے سب سے پہلے قریش میں دستور جاری کیا کہ سال میں دو مرتبہ تجارت کے لیے قافلہ روانہ ہوا کرے۔ موسم گرما میں شام کی طرف اور موسم سرما میں یمن کی طرف۔ اس دستور کے مطابق ہر موسم میں قافلہ روانہ ہوتا، لق ودق بیابانوں اور خشک ریگستانوں اور بر و بحر کو قطع کرتا ہوا موسم سرما میں یمن اور حبشہ تک پہنچتا۔ نجاشی شاہ حبشہ ہاشم کی بہت مدارات کرتا اور ہدایا پیش کرتا اور موسم گرما میں شام اور غزہ اور انقرہ (انگورہ جو اُس وقت قیصر روم کا پایۂ تخت تھا) تک پہنچتا۔ قیصر روم بھی ہاشم کے ساتھ نہایت احترام سے پیش آتا اور نذرانہ بھی پیش کرتا (طبقات ابن سعد ص ۴۳، ج ۱) ایک شاعر کہتا ہے ۔

سَفَرَيْن سَنَّهَا لَهُ وَلِقَومِهِ
سَفَرَ الشِّتَاءِ وَرِحْلَةَ الاَصْيَافِ

(ہاشم نے اپنی قوم کے لیے دو سفروں کا طریقہ جاری کیا، ایک سفر سردی کا اور دوسرا گرمی کا (معالم التنزیل)

اور ہاشم نے حکومتِ یمن اور حکومت روم سے قریش کے کاروانِ تجارت کی حمایت اور حفاظت کا حکم حاصل کیا، عرب کے راستے عموماً چونکہ لوٹ اور تجارت سے مامون نہ تھے، اس لیے ہاشم نے قبائل سے یہ معاہدہ کیا کہ ہم تمھاری ضرورتیں بہم پہنچایا کریں گے اور تم ہمارے قافلہ کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچانا۔ (طبقات ابن سعد ص ۴۵، ج ۱)

ہاشم کی اس حسن تدبیر کا یہ نتیجہ ہوا کہ تمام راستے مامون ہو گئے۔ حق جل شانہ نے اپنے کلام میں قریش کو یہ انعام یاد دلایا ہے:

لِاِيْـلٰفِ قُرَيْشٍ O اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ O فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ O الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ O

ترجمہ:

چونکہ قریش اللہ کی رحمت سے موسم سرما و گرما کے سفر کے عادی ہو گئے اس لیے ان کو نعمت کے شکریہ میں اس خدا کی عبادت کرنی چاہیے جو اس گھر کا مالک ہے، اور اس نے ان کو بھوک سے کھانے کو دیا اور خوف سے امن دیا۔

جب ایام حج آتے تو ہاشم تمام حجاج کو گوشت اور روٹی اور ستو اور کھجور یہ چیزیں کھلاتے اور زم زم کا پانی پلاتے، منیٰ اور مزدلفہ اور عرفات میں بھی اسی طرح کھانے اور پینے کا انتظام فرماتے۔
(سیرت المصطفیٰ ﷺ جلد اول ص ۳۱-۳۰)

ایک بار ہاشم قافلۂ تجارت کے ساتھ سفر کے لیے روانہ ہوئے، راستہ میں مدینہ منورہ ٹھہرے، وہاں بازار میں ایک عورت پر نظر پڑی، حسین وجمیل ہونے کے علاوہ شرافت ونجابت، فہم اور فراست اس کے چہرہ سے نمایاں تھی۔ ہاشم نے دریافت کیا کیا یہ عورت کسی کی منکوحہ ہے یا نا کتخدا ہے؟ معلوم ہوا کہ اصیحہ بن جلاح کی منکوحہ تھی جس سے عمر اور معبد یہ دولڑکے پیدا ہوئے۔ بعد میں اصیحہ نے اس کو طلاق دے دی۔ ہاشم نے اس سے نکاح کا پیام دیا۔ ہاشم کی نسبی شرافت اور ذاتی مکارم کی وجہ سے اس نے اس پیام کو قبول کرلیا اور نکاح ہوگیا۔ اُس عورت کا نام سلمٰی بنت عمرو تھا، جو قبیلہ بنی النجار سے تھی۔ نکاح کے بعد ہاشم نے ایک دعوت دی، جس میں تمام قافلے والے شریک تھے اور کچھ لوگ قبیلۂ خزرج کے بھی مدعو تھے۔ ہاشم نے نکاح کے بعد کچھ روز مدینہ میں قیام کیا۔ سلمٰی کو حمل ہوگیا۔ جس سے عبدالمطلب پیدا ہوئے۔ جس وقت پیدا ہوئے تو سر میں ایک بال سفید تھا، اس لیے شیبہ نام رکھا گیا۔ ہاشم قافلہ کے ساتھ غِزّہ کی جانب روانہ ہوئے۔ غزہ پہنچ کر ہاشم کا انتقال ہوگیا۔ وہیں مدفون ہوئے۔　(سیرۃ المصطفیٰ ﷺ جلد اول ص ۳۱-۳۲)

عبدالمطلب کے لفظی معنی ''مطلب کا غلام'' ہیں۔ ہاشم کے انتقال کے بعد عبدالمطلب کی والدہ ایک عرصہ تک مدینہ منورہ میں اپنے میکہ بنی خزرج ہی میں مقیم رہیں۔ جب عبدالمطلب ذرا بڑے ہوگئے تو ان کے چچا مطلب ان کو لینے کے لیے مکہ سے مدینہ آئے، جب ان کو لے کر واپس ہوئے تو مکہ میں داخل ہوتے وقت عبدالمطلب اپنے چچا مطلب کے پیچھے اونٹ پر سوار تھے۔ شیبہ کے کپڑے میلے کچیلے اور گرد آلود تھے، اور چہرے سے یتیمی ٹپکتی تھی۔ لوگوں نے مطلب سے دریافت کیا کہ یہ کون ہے؟ مطلب نے حیا کی وجہ سے یہ کہہ دیا کہ یہ میرا غلام ہے کہ لوگ نہ کہیں کہ بھتیجا ایسے میلے کپڑوں میں کیوں ہے۔ اس لیے عبدالمطلب کے نام سے مشہور ہوگئے۔ مطلب نے مکہ پہنچ کر بھتیجے کو عمدہ لباس پہنایا اور اس وقت ظاہر کیا کہ یہ میرا بھتیجا ہے۔

عبدالمطلب تمام قریش میں سب سے زیادہ حسین وجمیل اور سب سے زیادہ قوی اور جسم اور

سب سے زیادہ بُرد بار اور حلیم اور سب سے زیادہ سخی اور کریم اور سب سے زیادہ شر اور فتنہ سے بھاگنے والے تھے اور قریش کے مسلَّم سردار تھے۔ عبدالمطلب کا جود وکرم اپنے باپ ہاشم سے بڑھا ہوا تھا۔ عبدالمطلب کی مہمان نوازی انسانوں سے گزر کر چرند اور پرند تک پہنچ گئی تھی۔ اسی وجہ سے عرب کے لوگ ان کو فیاض اور مطعم طیر السماء (آسمان کے پرندوں کو کھانا کھلانے والا) کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ شراب کو اپنے اوپر حرام کیا ہوا تھا۔ جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا تو خاص طور سے فقراء اور مساکین کو کھانا کھلاتے۔ غارِ حرا میں سب سے پہلے خلوت وعزلت عبدالمطلب ہی نے کی۔

(ایضاً ص ۳۴-۳۳)

علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب قریش قحط سالی میں مبتلا ہوتے تو عبدالمطلب کو ثبیر پہاڑ پر لے جاتے، ان کی برکت سے باران رحمت کی دعا کرتے اور بارہا ایسا ہوا کہ قریش کی مشکلات عبدالمطلب کی برکت سے حل ہوئیں، ان کی شان عام اہل عرب سے بالکل جدا تھی، اپنی اولاد کو ظلم اور فساد سے منع کرتے اور مکارم اخلاق کی ترغیب دیتے، حقیر اور دنی امور سے روکتے، عبدالمطلب نذر کو پورا کرنے تاکید فرماتے اور محارم (مثلاً بہن اور پھوپھی اور خالہ وغیرہ) سے نکاح کرنے کو منع کرتے، شراب اور زنا اور لڑکیوں کو زندہ در گور کرنے سے اور بیت اللہ کا برہنہ طواف کرنے سے لوگوں کو روکتے، چوروں کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتے (زرقانی ص ۸۲ ج ۱) اور یہ وہ امور ہیں کہ قرآن وحدیث میں جن کی تصدیق وتاکید مذکور ہے، چنانچہ سیرت حلبیہ میں ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ عبدالمطلب سے جو امور منقول ہیں ان میں سے اکثر کا قرآن وحدیث میں حکم آیا ہے۔

صحیح مسلم میں واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے بنی کنانہ کو منتخب فرمایا اور بنی کنانہ سے قریش کو اور قریش سے بنی ہاشم کو اور ہاشم سے مجھ کو منتخب اور برگزیدہ فرمایا۔ ابن سعد کی ایک مرسل روایت میں اس قدر اور اضافہ ہے کہ بنی ہاشم میں سے عبدالمطلب کو پسند فرمایا۔ (سیرۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جلد اول ص ۳۹-۳۸)

جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد شام کے سفر سے واپسی میں بیمار ہوئے اور مکہ آنا دشوار ہوگیا تو اپنے والد کی ننہال ہی میں رک گئے، وہاں ان کے رشتہ داروں نے دل وجان سے تیمارداری کی، مگر وقت پورا ہو چکا تھا، جان بر نہ ہو سکے، وہیں ان کی وفات ہوئی، اور بنو النجار ہی نے ان کی تجہیز

وتکفین کی۔

عبدالمطلب کی نانہال، بالواسطہ آنحضرت (ﷺ) کی بھی نانہال ہے اس کا احساس بنی نجار اور آنحضرت ﷺ دونوں کو تھا۔

ایک بار آنحضرت ﷺ بنی نجار کے محلے سے گذر رہے تھے تو سنا کچھ کم سن بچیاں دف بجا رہی ہیں اور یہ شعر پڑھ رہی ہیں۔

نحن جوار من بنی النجار   یا حبذا محمد من جار

آنحضرت ﷺ نے سن کر فرمایا: **اللّٰھم بارک فیھن** (مجمع الزوائد ص۴۲، ج۱۰) اے اللہ تو ان میں برکت دے۔

میں سمجھتا ہوں یہ بچیاں اسی احساس کے ماتحت فخریہ طور پر یہ شعر پڑھ رہی تھیں۔ اور شاید اسی خصوصی تعلق کی بنا پر آنحضرت ﷺ اپنی پوشاک (اپنے استعمال کے کپڑے) بنی نجار ہی کے یہاں بُنواتے تھے۔ اور جلد تیار کرنے کا تقاضا کرنے کے لیے خود جایا کرتے تھے۔

حافظ ابوالشیخ اصبہانی (المتوفی ۳۶۹ھ) نے اپنی کتاب اخلاق النبی میں سند کے ساتھ یہ حدیث روایت کی ہے:

کان لرسول اللّٰہ ﷺ ثوبان ینسجان فی بنی النجار و کان یختلف الیھما. یقول: عجلوا بھما علینا نتجمل بھما فی الناس (۱۰۴۰)

آنحضرت ﷺ کے دو کپڑے بنی نجار کے یہاں بُنے جارہے تھے اور آپ بار باران کپڑوں کو دیکھنے جاتے تھے، فرماتے ہم کو جلدی تیار کر کے دو، ان کو پہن کر اچھی ہیئت میں لوگوں سے ملنا ہے۔

اس حدیث کو حافظ ابوالشیخ کے واسطہ سے حافظ ابوسعد سمعانی (المتوفی ۵۶۲ھ) نے ادب الاملاء و الاستملاء ص۲۶ میں بھی ذکر کیا ہے۔

حافظ ابوالشیخ نے حضرت سہل بن سعد کی روایت سے یہ حدیث بھی بیان کی ہے کہ ایک بار آنحضرت ﷺ کے لیے بھیڑ کی اون کا ایک جبہ سی کر تیار کیا گیا، آپ نے اس کو پہنا تو ایسا پسند کیا کہ دوسرا کپڑا اتنا پسند نہیں کیا، اس کو ہاتھ سے چھوتے تھے اور فرماتے دیکھو کتنا اچھا ہے۔ اتنے میں ایک

اعرابی (بدّو) آیا، اس نے کہا حضرت! یہ جبّہ مجھے عنایت فرما دیجیے، حضرت نے دے دیا، اور ویسا ہی دوسرا کپڑا بُننے کا حکم دیا، مگر اس کو زیب تن کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس لیے کہ وہ ابھی کارخانہ میں تیار ہی ہو رہا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی وفات ہوگئی۔ (اخلاق النبی ص ۱۲۱)

یہ کارخانہ محاکہ بھی غالبًا بنی النجار کا تھا، ورنہ بنوساعدہ کا رہا ہوگا، جو بنی نجار ہی کی طرح خزرج کی ایک شاخ ہے، اس لیے کہ اس کے راوی سہل بن سعد ساعدی ہیں اور وہ اس کو جس واقفیت اور دقت کے ساتھ بیان کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ان کا قریب کا تعلق ہے۔ اس کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ صحیح بخاری میں جو یہ حدیث مذکور ہے کہ ایک انصاری خاتون ایک کپڑا لائیں اور عرض کیا کہ حضرت! میں نے اس کو اپنے ہاتھ سے اس لیے بُنا ہے کہ آپ کو پہناؤں۔ تو اس کے راوی بھی حضرت سہل بن سعد ہی ہیں۔ بہر حال یہ تحقیق طلب ہے کہ جس (محاکہ) کا یہاں ذکر ہے وہ کس قبیلہ میں تھا، یہ تو یقینی ہے کہ وہ کارخانہ انصار ہی کا تھا۔

بنوالنجار کے اعلیٰ درجہ کی شرافت کا اس سے بہتر معیار اور کیا ہوسکتا کہ وہ اشرف قریش عبدالمطلب کے کفو اور رشتۂ ازدواج کے لیے قریش کے ہمسر تھے۔

اور اس سے بھی بڑا شرف و فضل ان کو یہ حاصل تھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان کے حق میں بروایت انس رضی اللہ عنہ یہ فرمایا: **ألا اخبركم بخير دور الأنصار قالوا: بلىٰ يارسول الله! قال: بنو النجار** (ترمذی ص ۳۷۱ ج ۴)

اور بروایت ابی اسید ساعدی یہ الفاظ فرمائے: **خير دور الأنصار دور بني النجار** (حوالہ سابق) اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ فرمایا: **خير ديار الأنصار دور بني النجار** (ترمذی ص ۳۷۲، ج ۴)۔

تینوں حدیثوں کا حاصل یہ ہے کہ انصار کے قبیلوں اور گھرانوں میں سب سے بہتر گھرانہ بنو نجار کا ہے۔

(دست کار اہل شرف ص ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، از محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ)

فارم کی مرغیوں کے کھانے کا حکم

مفتی جاوید احمد قاسمی
مدرسہ مرقاۃ العلوم، مئو

سوال:- آج کل مرغی کے بچوں کے لیے جو غذا تیار ہوتی ہے اس میں چاول، پالش، مچھلی کی آنت، اوجھڑی اور خنزیر کی چربی، پسی ہوئی ہڈی، چربی اور خون شامل ہوتا ہے، کیا ایسی غذا جانوروں کو کھلانا اور انھیں تیار کر کے ان کی تجارت کرنا اور ان مرغیوں کو کھانا جائز ہے؟

جواب:- اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ذبح شدہ حلال جانور کے گوشت کے اجزاء ہیں اور حلال مذبوحہ کی چربی اور ہڈی ہے تو ان تمام چیزوں کے جائز اور پاک ہونے میں شک وشبہ نہیں ہے اور ان کے ذریعہ جانوروں کو کھلانے کے لیے جو غذا تیار کی جاتی ہے، ان غذاؤں کے استعمال اور ان کی تجارت بھی بلاشبہ جائز اور حلال ہے اور اگر حرام جانوروں کے اجزا ہیں یا غیر مذبوح جانوروں کے گوشت کے اجزاء مثلاً مردار وغیرہ کے گوشت، چربی وغیرہ ہیں تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر بعینہ اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں تو انھیں جانوروں کے غذاء کی طور پر استعمال کرنا جائز نہ ہوگا، اور نہ ہی ان کی تجارت جائز ہوگی اور اگر ان اجزاء کو تبدیل ماہیت کے ذریعہ ان کی حقیقت بدل دی جائے جس سے ان اشیاء کا رنگ بو، مزہ اور نمایاں اثرات ختم ہو کر دوسری چیز بن جائے تو اس کو جانوروں کی غذا کے طور پر استعمال کرنا جائز ہو جاتا ہے اور اس کی تجارت بھی جائز ہے اور ان مرغیوں کا کھانا بھی جائز ہوگا۔ (مستفاد فتاویٰ قاسمیہ ج ۲۴ ص ۱۸۲)

حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے، ایسی غذا کی خرید وفروخت اور مرغیوں کو کھلانا جائز نہیں، البتہ ایسی مرغیاں حلال ہیں۔ گوشت کی حرمت کے لیے شرط یہ ہے کہ نجس غذا کی وجہ سے گوشت میں بدبو پیدا ہو جائے، جس کا مفقود ہونا یہاں مشاہد ہے۔ (احسن الفتاویٰ ج ۸ ص ۱۲۶)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں، کہ ایسی مرغی کا گوشت حلال ہے، اگر خوراک میں غالب حرام ہو تو بہتر ہے کہ ایسی مرغی کو تین روز تک بند رکھ کر حلال غذا دی جائے پھر ذبح کیا جائے، البتہ اگر مرغی کے گوشت میں حرام غذا اور نجاست وغیرہ کھانے سے بدبو پیدا ہو جائے تو اس کو اتنی مدت بند رکھ کر

حلال غذا دینا ضروری ہے کہ بدبو زائل ہوجائے، بدبو زائل ہونے سے قبل ذبح کردیا تو اس کا گوشت حلال نہ ہوگا۔ (احسن الفتاویٰ ج ۷ ص ۴۰۸)

فتاویٰ حقانیہ میں ہے، اگر ان مرغیوں میں نجاست اور خون ملی ہوئی خوراک کھانے کی وجہ سے بدبو پیدا ہوجاتی ہو تو پھر ان کا کھانا ناجائز اور خرید وفروخت مکروہ ہے، اور اگر ان مرغیوں کو نجاست اور خون وغیرہ کھلانا بند کرکے پاک غذا کھلائی جائے، یہاں تک کہ ان کی بدبو بالکل ختم ہوجائے تو پھر ان کا کھانا، بیع وشراء اور ہبہ وغیرہ سب درست ہے۔

چونکہ اس بارے میں تحقیق کرنے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ مرغیوں کی غذا میں خون یا دوسرے نجس اجزاء نہایت کم مقدار میں ہوتے ہیں، دوم یہ کہ اس غذا کی تیاری میں کیمیکلز استعمال ہوتے ہیں جس کی وجہ سے خون اور دیگر نجس اجزاء کی ماہیت بدل جاتی ہے، لہٰذا قلبِ ماہیت اور اجزائے نجسیہ کے مغلوب ہوجانے کی وجہ سے فارمی مرغیوں کا کھانا، ان کی خرید وفروخت اور ہبہ وغیرہ سب درست اور جائز ہے۔ (فتاویٰ حقانیہ۔ ص ۱۱۲ ج ۶)

اگر ان مرغیوں میں بدبو پیدا ہوجائے تو یہ جلالہ کے حکم میں ہے، **الجلالة هي التي تأكل العذرة ولا تأكل غيرها حتى أنتن لحمها .** (قواعد الفقہ ص ۲۵۰)

یعنی وہ جانور جو پلیدی ہی کھاتا ہو دوسری چیز نہ کھاتا ہو یہاں تک کہ اس کے گوشت میں بدبو پیدا ہوجائے، خلاصہ یہ ہے کہ فقہاء کے یہاں جلالہ کے گوشت میں کراہت تحریمی کی علت صرف نجاست کھانا نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ سے اتنا تغیر پیدا ہوجائے کہ بدبو آنے لگے اسی لیے جو جانور نجاست کے ساتھ دوسری غذا بھی کھاتا ہے تو اس میں چونکہ بدبو پیدا نہیں ہوتی اس لیے اس کا کھانا مکروہ نہیں ہے۔ (محمود الفتاویٰ ج ۳ ص ۱۴۴)

ان الكراهة في الجلالة لمكان التغير والنتن لا لتناوله النجاسة ولهٰذا اذا خلطت لا يكره وان وجد تناوله النجاسة لأنها لا تنتن فدل أن العبرة للنتن لا لتناوله النجاسة. (بدائع الصنائع ج ۵ ص ۴۰ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

علامہ شامی رحمہ اللہ نے لکھا ہے اس جلالۃ کا گوشت اور دودھ مکروہ ہے جو صرف نجاست کھائے اور اس میں بدبو آنے لگی ہو **وكره لبن الجلالة التي تاكل العذرة اى فقط حتى انتن لحمها قال في شرح الوهبانية: وفي المنتقىٰ الجلالة المكروهة التي اذا قربت وجدت منها**

رائحة فلا توكل ولا يشرب لبنها. (الدر المختار مع رد المحتار ج۹ص۴۹۱)

اگر وہ مرغی ان حرام غذاؤں کے ساتھ حلال غذا بھی کھاتی ہو تو اس مرغی کا کھانا بالکل حلال ہے **لا باس باكل الدجاج لانه يخلط ولا يتغير لحمه.** (شامی ج۹ص۴۹۱، ۴۹۲)

ولـذا قـال فـي الـجوهرة فان كانت تخلط او اكثر علفها علف الدواب لا يكره سورها. (شامی ج۱ص۳۸۳)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم نے لکھا ہے اگر چارے میں فضلہ وغیرہ ملا دیا جائے تو پھر ایسی مخلوط غذا کھانے والا جانور جلالۃ شمار نہ کیا جائے گا۔ علامہ شامی علیہ الرحمہ نے اس کو صراحت سے لکھا ہے **أفاد أنها اذا كانت تخلط تجزى .** (شامی ج۹ص۴۷۰، کتاب الفتاویٰ ج۴ص۱۹۱)

کسی بھی حلال جانور کے جلالۃ ہونے کے لیے دو شرطیں لازم ہیں، ان دونوں شرطوں کے بغیر جانور کو جلالہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

شرط نمبر (۱) اس حلال جانور کی غذا صرف نجاست اور گندگی ہو، نجاست اور گندگی کے علاوہ کوئی پاک چارہ نہ کھاتا ہو۔

شرط نمبر (۲) نجاست اور گندگی کھانے کی وجہ سے اس کے گوشت سے بدبو نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہو، حتی کہ اس کے پسینے سے بھی ظاہر ہوتی ہو تو ایسے جانور کو جلالہ کہا جاتا ہے جس میں یہ دونوں شرطیں ایک ساتھ پائی جائیں، لہذا اگر مستقل نجاست کھانے کے باوجود اس جانور کے گوشت میں نجاست کی بدبو اور اثرات نمایاں نہ ہوں تو وہ جلالہ میں شامل نہیں ہوتا اور اس حلال جانور کو کھانا بلا کراہت جائز ہے۔ (فتاویٰ قاسمیہ ص۱۰۶ جلد۲۴)

اس کو صاحب بدائع نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے۔

روى ابـن رستم عن محمد فى الناقة الجلالة، او الشاة، والبقر الجلال أنها إنـمـا تـكون جلالة إذا تفتت وتغيرت ووجد منها ريح منتنة، فهي الجلالة حينئذ لا يشـرب لبـنهـا ولا يـوكـل لـحمها، وبيعها وهبتها جائز هٰذا اذا كانت لا تخلط ولا تـأكـل إلا الـعذرة غالباً وإن خلطت فليست جلالة. فلا تكره لأنها لاتنتن ولا يكره أكـل الدجاج المخلىٰ وإن كان يتناول النجاسة لانه لا يغلب عليه أكل النجاسة بل يخلطها بغير ها وهو الحب. (ج۵ص۴۰)

اور مبسوط سرخسی میں اس کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔

وإنما يشترط ذٰلک فی الجلالة التی لا تأکل إلا الجیف. (ج۱۱ص۲۴۰)

اور امام زیلعی نے اس کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

والجلالة هی التی تعتاد أکل الجیف، والنجاسات ولا تخلط فیتغیر لحمها فیکون منتناً. (تبیین الحقائق ج۶ص۱۰)

اگر مرغی جلالہ ہو یعنی نجاست کھاتے کھاتے اس کے گوشت میں بد بو ہوگئی ہو تو مستحب یہ ہے کہ اس کو ایک قول کے مطابق تین دن اور دوسرا قول یہ ہے کہ جتنے وقت میں اس جانور کے بدن سے نجاست کھانے کی بد بو ختم ہو جائے اتنے وقت تک بند رکھا جائے، اور اس وقت کی کوئی تعیین نہیں اور بند رکھنے کے بعد جب اس کے بدن سے بد بو ختم ہو جائے مستحب طریقہ سے ذبح کیا جائے۔ اور جانور پالنے والے کو خود اس کا اندازہ ہو جائے گا۔ اس کو امام شمس الائمۃ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے مبسوط سرخسی میں زیادہ صحیح اور راجح قرار دیا ہے ملاحظہ ہو:

وإنما يشترط ذلک فی الجلالة التی لاتأکل الا الجیف وفی الکتاب: قال تحبس أیاماً علی علف طاهر قیل ثلاثة أیام وقیل عشرة أیام والأصلح أنها تحبس إلی أن تزول الرائحة المتنة عنها لأن الحرمة لذلک وهو شیئ محسوس ولا یتقدر بالزمان لاختلاف الحیوانات فی ذلک فیصار فیه إلی اعتبار زوال المضر، فإذا زال بالعلف الطاهر حل تناوله والعمل علیه بعد ذلک. (المبسوط للسرخسی ج۱۱ص۲۴۰ آخر کتاب الصید)

اس کو صاحب بدائع نے اس طرح کے الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

وذکر القاضی فی شرحه مختصر الطحاوي أنه لا یحل الانتفاع بها من العمل وغیره إلا أن تحبس أیاماً وتعلف فحینئذ تحل وما ذکر القدوری رحمه اللّٰه اجود لان النهی لیس لمعنی یرجع الی ذاتها بل لعارض جاورها فکان الانتفاع بها حلالاً فی ذاته إلا أنه یمنع عنه لغیره، ثم لیس لحبسها تقدیر فی ظاهر الروایة هٰکذا روی عن محمد رحمه اللّٰه أنه قال کان أبو حنیفة رحمه الله تعالیٰ لا یوقت فی حبسها وقال: تحبس حتی تطیب وهو قولهما ایضاً وروی أبو یوسف عن أبی حنیفة علیه الرحمة أنها تحبس ثلاثة أیامٍ .... والأفضل أن تحبس الدجاج حتی یذهب ما فی بطنها من النجاسة لما

روی ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یحبس الدجاج ثلثۃ أیام ثم یاکلہ وذلک علی طریق التنزہ وھو روایۃ أبی یوسف عن ابی حنیفۃ علیھما الرحمۃ انھا تحبس ثلثۃ ایام کانہ ذھب إلی ذلک للخبر ولما ذکرنا أن ما فی جوفھا من النجاسۃ یزول فی ھذہ المدۃ ظاھراً وغالباً. (بدائع الصنائع ج۵ص۴۰)

اسی طرح اگر پانی میں نجاست کے گرنے سے پانی کا رنگ، مزہ بو نہ بدلا تو ایسا پانی اگر چہ آدمی کے لیے پینا جائز نہیں ہے تاہم ایسے پانی سے مٹی بھگائی جاسکتی ہے اسی طرح چوپایوں کو پلایا جاسکتا ہے۔الماء إذا وقعت فیہ نجاسۃ فإن تغیر وصفہ لم یجز الانتفاع بہ بحال وإلا جاز کبلِّ الطین وسقی الدواب. شامی ج۱ص۳۵۳)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ ناپاک پانی پینے سے حلال جانوروں کا گوشت کھانا ناجائز نہیں ہوگا بلکہ جائز ہی رہے گا۔اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کا ایک فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:

سوال:-ڈبل روٹی پر جیلی لگا کر کھاتے ہیں بعض لوگ اس کو ناجائز کہتے ہیں کیونکہ یہ جانور کی کھال اور ہڈی سے بنتی ہے آپ کی تحقیق کیا ہے؟

جواب:-اولاً جیلی کا ہڈی اور کھال سے بنایا جانا ضروری نہیں، درختوں کے پتوں وغیرہ سے بھی بنائی جاتی ہے۔

ثانیاً:-اگر کھال وغیرہ سے بنائی گئی ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ کھال مردار ہی کی ہو، حلال ذبیحہ کی کھالیں غالب ہیں۔

ثالثاً:-جیلی کی صنعت میں تبدیل ماہیت کا احتمال بھی ہے،اس صورت میں حرام جانور کی کھال سے بنی ہوئی جیلی بھی حلال ہے۔

زیادہ تجسس اور کھود کرید کرنا اور احتمالات اور اوہام کی بناء پر احتراز کرنا دین میں تعمق اور غلو ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے اور بلا دلیل شرعی حرمت کا حکم لگانا دین میں زیادتی اور تحریف ہے۔

(احسن الفتاویٰ ج۸،ص۱۲۸)

اشیاءِ خوردنی میں اصل حکم اباحت اور حلت کا ہے،لہٰذا جب تک کسی چیز کی حرمت قطعی اور یقینی طور پر پایۂ ثبوت کو نہ پہنچے تو محض شبہہ کی وجہ سے اس پر حرمت کا حکم نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ الأصل فی الاشیاء الإباحۃ (قواعد الفقہ ص۵۹)

شک فی وجود النجس فالأصل بقاء الطهارة (الاشباہ والنظائر ج۱ص۱۹۹)

شامی میں ہے کہ جو اپنے برتن یا کپڑے یا بدن کے بارے میں شک کرے کہ نجاست لگی ہے یا نہیں، تو وہ پاک ہے جب تک یقین نہ کرے اور یہی مسئلہ ہے ان کنوؤں اور حوضوں کا جو راستوں میں بنائے جاتے ہیں کہ ان سے پانی نکالتے ہیں بچے اور بڑے اور مسلمان اور کافر یعنی ان کا پانی پاک رہے گا۔ اور ایسے ہی پاک رہیں گی وہ چیزیں جو مشرکین یا جاہل مسلمان بناتے ہیں جیسے گھی، روٹی اور کھانے اور کپڑے، **من شک فی إنائه أو ثوبه أو بدنه اصابته نجاسة أو لا فهو طاهر مالم یستیقن وکذا الأبار والحیاض والحباب الموضوعة فی الطرقات ویستقی منها الصغار والکبار والمسلمون والکفار وکذا ما یتخذه أهل الشرک او لجهلة من المسلمین کالسمن والخبز والأطعمة والثیاب.** (شامی ج۱ص۲۸۳،۲۸۴)

تبدیل ماہیت کے سلسلے میں فقہ اکیڈمی کا فیصلہ یہ ہے، شریعت میں جن اشیاء کو حرام یا ناپاک قرار دیا گیا ہے ان کی حرمت ونجاست اس شیئ کی ذات سے متعلق ہے۔ اگر کسی انسانی فعل، کیمیائی یا غیر کیمیائی تدبیر یا کسی انسانی فعل کے بغیر طبعی اور ماحولیاتی اثر کے تحت اس شیئ کی اصل حقیقت اور ماہیت تبدیل ہوگئی تو اس شیئ کا سابق حکم باقی نہیں رہے گا اس میں نجس العین اور غیر نجس العین کا کوئی فرق نہیں۔ تبدیل ماہیت سے مراد یہ ہے کہ اس شیئ کے وہ خصوصی اوصاف بدل جائیں جن سے اس شیئ کی شناخت متعلق ہے ''دوسرے غیر مؤثر اوصاف جو اس شیئ کی حقیقت میں داخل نہیں''، کا اس شیئ میں باقی رہ جانا تبدیل ماہیت میں مانع نہیں۔ (جدید فقہی تحقیقات ص۳۵،۳۶، ج۱۰)

جانوروں کے فضلات اور آلائش وغیرہ کی آمیزش سے جانوروں کے لیے جو غذائیں تیار کی جاتی ہیں جس سے پرورش پانے والے جانوروں کے گوشت غذا میں استعمال کیے جاتے ہیں، یہ تیاری کئی مراحل سے گزرتی ہے، کہ خون، گندگی اور مردار کے اجزا وغیرہ پر مشتمل یہ نجاسات اور فضلات پہلے بڑے دیگوں میں پکائے جاتے ہیں، اور اس طرح ان کے سارے جراثیم اور بیکٹر یا ختم کردیے جاتے ہیں، پھر انھیں خشک کیا جاتا ہے، اور اس کے بعد انھیں پیسا جاتا ہے، پھر اس سفوف میں وٹامن والی دوسری اشیاء اور اجزاء ملائے جاتے ہیں اور اس طرح وہ غذا بن کر تیار ہوتی ہے، اس عمل سے گزرنے کے بعد سابق نجاست کے اوصاف بدل جاتے ہیں، رطوبت کی جگہ خشکی آجاتی ہے، رنگ دوسرا ہوجاتا ہے، اور دوسرے کیمیائی مواد کے اضافہ کی وجہ سے نجاست کی بو بھی ختم ہوجاتی ہے۔ اب

اس کا نام بھی نیا ہوتا ہے، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ان اوصاف میں تبدیلی کی وجہ سے نجاست کی حقیقت بدل گئی، اور انقلاب ماہیت ہوگیا۔ (جدید فقہی تحقیقات ص ۵۱، ج ۱۰)

ادارۃ المباحث الفقہیۃ جمعیۃ علماء ہند کے گیارہویں فقہی اجتماع منعقدہ دارالعلوم حیدرآباد میں یہ تجاویز پاس ہوئیں۔

(۱) ماہیت بدل جانے سے ناپاک اشیاء پاک ہوجاتی ہے۔

(۲) تبدیل ماہیت شیئ کی بنیادی اوصاف کی تبدیلی سے متحقق ہوجائے گی، مادہ کی تبدیلی ضروری نہیں۔

(۳) بنیادی اوصاف کی معرفت کا مدار ادلۂ شرعیہ پر ہے، اگر ادلۂ شرعیہ سے معرفت حاصل نہ ہوسکے تو عرفِ عام میں جن اوصاف کے بدلنے کو شیئ کی تبدیلی سمجھا جاتا ہے وہی اوصاف بنیادی اوصاف ہوں گے، البتہ جن چیزوں کے اوصاف کا علم عرفِ عام سے بھی نہ ہوسکے تو ان میں ان کے ماہرین سے رائے لی جائے گی۔

(۴) بوائلر مشینوں کے ذریعہ تصرف کے بعد مذکورہ معیار کے مطابق جن چیزوں میں تبدیلی ماہیت کا تحقق ہوجائے ان میں پاکی کا حکم ہوگا، بصورت دیگر پاکی کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، البتہ اگر ان مشینوں سے گزرنے والی ناپاک چیز تجزیہ وتحلیل اور کیمیکل کے استعمال کے ذریعہ ناپاک اجزاء کو بالکلیہ الگ کردیا جائے تو اسے بھی استحالہ کے درجہ میں رکھ کر استعمال کی گنجائش ہوگی۔

(۵) بعض اشیاء کا محض سکھا دینا سبب طہارت تو ہے مگر تبدیلِ ماہیت نہیں، البتہ کیمیکل کے ذریعہ تجزیہ واستحالہ ممکن ہے، (فقہی اجتماعات کے اہم فقہی فیصلے وتجاویز ص ۱۰۸، ۱۰۹)

حنفیہ کے یہاں تحویل حقیقت کی وجہ سے ایسی چیزیں بھی پاک ہوجاتی ہیں، جو اپنی ذات میں ناپاک ہیں، جیسا کہ خنزیر اور کتے، گدھے وغیرہ کے نمک بن جانے اور فضلات کے مٹی بن جانے کا مسئلہ ہے، اس لیے جو شیئ اپنی ذات میں ناپاک نہ ہو، بلکہ کسی ناپاک چیز کے اتصال کی وجہ سے ناپاک ہوگئی ہو وہ تو بدرجۂ اولیٰ انقلاب حقیقت کی وجہ سے پاک ہوجائے گی، چنانچہ علامہ شامی ؒ نے مجتبیٰ کے حوالہ سے مسئلہ نقل کیا ہے کہ ناپاک تیل صابن میں ملایا گیا ہو تو تغیر کی وجہ سے اس کے پاک ہونے کا حکم لگایا جائے گا، پھر لکھا ہے کہ بظاہر یہ حکم مردار کی چربی کا بھی ہوگا، کیوں کہ مصنف نے ''نجس'' کا لفظ استعمال کیا ہے نہ کہ متنجس کا، پھر اس کی تائید میں کبیری سے یہ جزئیہ نقل کیا ہے کہ اگر انسان، یا کتا صابن بنانے

والے دیگ میں گر جائے اور صابن بن جائے تو انقلاب حقیقت کی وجہ سے اسے پاک سمجھا جائے گا۔
اسی طرح اگر گوریا کنویں میں گر کر مٹی ہو جائے تو اب اس کا نکالنا ضروری نہیں اس کے استحالہ کی وجہ سے اب وہ پاک ہے اسی طرح شراب سرکہ بن جائے اور گدھا نمک کی کان میں گر کر نمک ہو جائے اور پاخانہ مٹی یا راکھ بن جائے تو یہ سب پاک ہیں۔اسی طرح ایسے تنور کی روٹی پاک ہے جس پر ناپاک پانی چھڑکا گیا ہو یا ایسی ناپاک مٹی سے کوزہ بنا کر آگ پر پکادیا گیا ہو تو یہ بھی پاک ہو جائے گا۔

ویطهر زيت تنجس بجعله صابوناً به يفتى للبلوىٰ، كتنور رش بماء نجس لابأس بالخبز فيه كطين تنجس فجعل منه كوز بعد جعله على النار يطهر إن لم يظهر فيه أثر النجس بعد الطبخ. ذكره الحلبى.

وفي الشامي:- ثم هذه المسئلة قد فرعوها على قول محمد بالطهارة بانقلاب العين الذي عليه الفتوىٰ، واختاره أكثر المشايخ خلافاً لأبي يوسف كما في شرح المنية والفتح وغيرهما، وعبارة المجتبىٰ، جعل الدهن النجس في صابون يفتىٰ بطهارته لانه تغير، والتغير يطهرعند محمد ويفتىٰ به للبلوىٰ. وظاهره أن دهن الميتة كذلك لتعبيره بالنجس دون المتنجس، إلا أن يقال: هو خاص بالنجس لأن العادة في الصابون وضع الزيت دون بقية الأدهان، تأمل ثم رأيت في شرح المنية ما يؤيد الأول حيث قال: وعليه يتفرع مالو وقع إنسان أو كلب في الصابون فصار صابوناً يكون طاهراً لتبدل الحقيقة.

ثم اعلم أن العلة عند محمد هي التغير وانقلاب الحقيقة، وأنه يفتىٰ به للبلوىٰ كما علم مما مر، ومقتضاه عدم اختصاص ذلک الحكم بالصابون فيدخل فيه كل ماكان فيه تغير وانقلاب حقيقة وكان فيه بلوىٰ عامة، فيقال: كذلک فى الدبس المطبوخ إذا كان زبيبه متنجساً، ولاسيما أن الفأر يدخله فيبول ويبعر فيه وقد يموت فيه، وفيه بحث كذلک بعض شيوخ مشائخنا فقال: وعلى هذا اذا تنجس السمسم ثم صار طحينة يطهر، خصوصاً وقد عمت به البلوىٰ، وقاسه على ما إذا وقع عصفور في بئر حتى صار طيناً لا يلزم إخراجه لا ستحالته ..... بخلاف نحو خمر صار خلاً، وحمار وقع في مملحة فصار ملحاً، وكذا دردى خمر صار طرطيراً، وعَذرة صارت رماداً أو حمأة، فإن ذلک كله انقلاب حقيقة إلى حقيقة أخرىٰ، لا مجرد انقلاب وصف. (الدرالمختار مع ردالمحتار ص۵۱۹،۵۲۰،ج۱)

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے، قلب ماہیت تو یہ ہے کہ سابق حقیقت معدوم ہوکر نئی حقیقت ونئی ماہیت بن جائے، نہ پہلی حقیقت وماہیت باقی رہے نہ اس کا نام باقی رہے نہ اس کی صورت وکیفیت باقی رہے، نہ اس کے خواص وآثار وامتیازات باقی رہیں، بلکہ سب چیزیں نئی ہوجائیں، نام بھی دوسرا، صورت بھی دوسری، آثار وخواص بھی دوسرے، اثرات وعلامات اور امتیازات بھی دوسرے پیدا ہوجائیں، جیسے شراب سے سرکہ بنالیا جائے۔ (منتخبات نظام الفتاویٰ ص ۱۱۵، ج ۱)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے، فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب حقیقت مطہر ہے، لیکن انقلاب وصف مطہر نہیں۔ (امداد الفتاویٰ ص ۹۲، ج ۴)

سوال: خنزیر وغیرہ کے خشک پاخانہ سے مٹی کا برتن پکایا ہوا استعمال کرسکتے ہیں یا نہیں۔

جواب: جزئیہ نہیں دیکھا کلیات سے جواز معلوم ہوتا ہے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۹۱، ج ۴)

سوال: خاکستر عقرب کا استعمال اکلاً جائز ہے یا نہیں، جب وہ جل کر خاک ہوگیا تو بوجہ قلب ماہیت جائز ہوجانا چاہئے کالخمر المتخلل وغیرہا۔

جواب: جائز ہے، لما ذکر فی السوال۔ (امداد الفتاویٰ ص ۱۰۱، ج ۴)

سوال: ایک شخص نے اپنے شتر کو خنزیر کا گوشت کھلایا بوجہ فربہ ہونے کے اگر اس شتر کو ذبح کیا جاوے تو وہ گوشت اس اونٹ کا کھانا جائز ہوگا کہ نہیں؟

جواب: ایسے شتر کا گوشت حلال ہوگا، مگر ذبح سے پہلے بعض علماء کے نزدیک واجب ہے کہ اس کو چند روز تک حلال چارہ دیا جائے اس کے بعد اس کو ذبح کیا جائے۔

سوال: شاہجہاں پوری چینی جس کو مورسس کی چینی وغیرہ بھی کہتے ہیں یعنی ریزہ دار چینی ہوتی ہے اس کو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہڈی سے صاف ہوتی ہے تو ہڈی سے صاف ہوتی یا نہیں اور اس کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

جواب: تحقیق سے معلوم ہوا کہ ہڈی کو جلادیتے ہیں پس وہ طاہر ہوتی ہے اس لیے جواز استعمال میں کچھ شبہہ نہیں۔ (امداد الفتاویٰ ص ۱۰۵، ج ۴)

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے انقلاب حقیقت سے طہارت ونجاست کا حکم بدل جاتا ہے یہ حکم طہارت بانقلاب حقیقت امام محمد علیہ الرحمہ کا قول ہے اور اسی پر فتویٰ ہے اور اکثر مشائخ نے اسی کو اختیار کیا ہے، صابن میں روغن نجس یا چربی کی حقیقت بدل جاتی ہے، اور انقلاب

عین حاصل ہوجاتا ہے پس اب سوال کا جواب واضح ہوگیا کہ صابن خواہ کسی چیز کی چربی یا روغن نجس سے بنایا جائے صابن بن جانے کے بعد وہ پاک ہوجاتا ہے، اور اس کا استعمال جائز ہے، کیونکہ انقلاب حقیقت کی وجہ سے وہ چربی اور روغن روغن نہ رہا بلکہ صابن ہوکر پاک ہوگیا جیسے مشک اصل میں خون ناپاک ہوتا ہے لیکن مشک بن جانے کے بعد وہ پاک اور جائزالاستعمال ہوجاتا ہے پس ولایتی صابون کے استعمال کے لیے اس تحقیقات کی کچھ ضرورت نہیں کہ اس کے اجزاء کیا ہیں؟ وہ پاک ہیں یا ناپاک؟ کیونکہ حقیقت صابونیہ اس کی طہارت کی کفیل ہے، جیسے کہ حقیقت مسکیہ اس کی طہارت کی ضامن ہے۔

اگر کسی کو شبہہ ہو کہ روایات مذکورہ سابقہ سے روغن نجس کے صابون کا پاک ہونا ثابت ہوتا ہے، لیکن ممکن ہے کہ یہ حکم روغن کے ساتھ خاص ہو، کیونکہ اصل اس کی پاک ہے، ناپاکی باہر سے اسے عارض ہوئی ہے پس اس سے خنزیر کی چربی کے صابون کا حکم نکالنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ خنزیر اور اس کے اجزاء نجس العین ہیں تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ انقلاب عین سے پاک ہوجانا نجس العین اور غیر نجس العین دونوں میں یکساں طور پر جاری ہوتا ہے خون بھی نجس العین ہے مشک بن جانے سے پاک ہوجاتا ہے، خود خنزیر کا انقلاب حقیقت کے بعد پاک ہوجانا بھی روایات ذیل سے ثابت ہے۔

پھر اس کے بعد مفتی صاحب علیہ الرحمہ نے بہت سی فقہی عبارتیں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔ان نصوص فقہیہ سے امور ذیل ثابت ہوتے ہیں:

(۱) گدھا، خنزیر، کتا، انسان انقلاب حقیقت کے حکم میں سب برابر ہیں کچھ تفاوت نہیں۔

(۲) یہ کان نمک میں گر کر مریں یا مرے ہوئے گریں، دونوں حالتوں میں یکساں حکم ہے، یعنی میتہ جو بنص قرآنی حرام اور نجس ہے وہ بھی اسی حکم میں شامل ہے۔

(۳) انسان جس کے اجزاء سے بوجہ کرامت انتفاع حرام ہے اور خنزیر و میتہ جن سے بوجہ نجاست انتفاع حرام ہے، انقلاب حقیقت کے بعد ان پر انسان اور خنزیر و میتہ کا حکم باقی نہیں رہتا، بلکہ بعد انقلاب حقیقت پاک اور جائزالانتفاع ہوجاتے ہیں جب کہ انقلاب، حقیقت طاہرہ کی طرف ہو۔

(۴) کان نمک میں گرنے اور صابون کی دیگ میں گرنے کا حکم یکساں ہے کہ یہ دونوں صورتیں موجب انقلاب حقیقت ہیں جیسا کہ کبیری شرح منیہ کی عبارت میں صراحۃً مذکور ہے۔

ان امور کے ثبوت کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ خنزیر یا میتہ یا کتے کی چربی سے بنے ہوئے صابون کے جواز استعمال میں تردد کیا جائے۔اور یہ شبہہ کچھ وقعت نہیں رکھتا کہ خنزیر بنص قرآنی حرام

اور نجس ہے۔ پس صابون بن جانے کے بعد اس کی طہارت کا حکم کرنا نص قرآنی کا معارضہ ہے۔
جواب اس کا یہ ہے کہ یہ معارضہ نہیں نص قرآنی نے خنزیر یا میتۃ کو نجس بتایا ہے لیکن نمک یا صابون بن جانے کے بعد وہ خنزیر یا میتۃ ہی کہاں رہے، دیکھو شراب بنص قرآنی حرام اور نجس ہے اور سرکہ بن جانے کے بعد باتفاق وہ پاک اور حلال ہو جاتی ہے، پس جس طرح کہ شراب منصوص النجاسۃ پر سرکہ بن جانے کے بعد طہارت وحلت کا حکم کرنا نص قرآنی کا معارضہ نہیں اسی طرح خنزیر کے صابون بن جانے کے بعد اس کی طہارت کا حکم نص قرآنی کا معارضہ نہیں۔

اصل یہ ہے کہ شریعت نے جس حقیقت پر نجاست کا حکم لگایا تھا، وہ حقیقت ہی نہیں رہی اور بعد انقلاب جو حقیقت متحقق ہوئی وہ شریعت کے نزدیک پاک ہے، پس یہ حکم طہارت بھی حکم شرعی ہے نہ غیر۔ (کفایت المفتی ص ۳۳۱ تا ۳۳۳، ج ۲)

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے لکھا ہے جب الکحل دواؤں میں ملایا جاتا ہے تو کیا اس عمل کے بعد الکحل کی حقیقت اور ماہیت باقی رہتی ہے؟ یا اس کیمیاوی عمل کے بعد اس کی ذاتی حقیقت اور ماہیت ختم ہو جاتی ہے؟ اگر الکحل کی حقیقت اور ماہیت ختم ہو جاتی ہے اور اس کیمیاوی عمل کے بعد وہ الکحل نہیں رہتا، بلکہ دوسری شئ میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس صورت میں تمام ائمہ کے نزدیک بالاتفاق اس کا استعمال جائز ہے اس لیے کہ شراب جب سرکہ میں تبدیل ہو جائے تو اس وقت تمام ائمہ کے نزدیک حقیقت اور ماہیت کی تبدیلی کی وجہ سے اس کا استعمال جائز ہے۔

سوال: یہاں مغربی ممالک میں ایسے خمیرے اور جیلیٹن ملتی ہے جن میں خنزیر سے حاصل کردہ مادہ تھوڑی یا زیادہ مقدار میں ضرور شامل ہوتا ہے کیا ایسے خمیرے اور جیلیٹن کا استعمال شرعاً جائز ہے؟

جواب: اگر خنزیر سے حاصل شدہ عنصر کی حقیقت اور ماہیت کیمیاوی عمل کے ذریعہ بالکل بدل چکی ہو تو اس صورت میں اس کی نجاست اور حرمت کا حکم بھی ختم ہو جائے گا اور اگر اس کی حقیقت اور ماہیت نہیں بدلی تو پھر وہ عنصر نجس اور حرام ہے اور جس چیز میں وہ عنصر شامل ہوگا وہ بھی حرام ہوگی۔

(فقہی مقالات ص ۲۵۵، ج ۱)

ان تمام عبارتوں سے یہ بات ثابت ہوئی کہ بلا وجہ فارم کی مرغیوں کے گوشت کو ناجائز نہیں کہنا چاہئے۔

واللہ أعلم بالصواب.

وفیات

مسعود احمد الاعظمی

ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

۱۸ ربیع الاول ۱۴۳۹ھ مطابق ۸ دسمبر ۲۰۱۷ء سے ۱۲ ربیع الآخر مطابق ۳۱ دسمبر تک خال محترم حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی دام ظلہ العالی کی معیت میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں قیام اور عمرہ کی ادائیگی کی سعادت حاصل ہوئی۔ اسی مدت میں ایک صبح ایک علمی مجلس میں ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے، درمیان میں تھوڑا سا موقع پاکر احقر نے اپنا موبائل کھولا تو اس کے پیغاموں میں ایک افسوسناک خبر نظر آئی، جس سے بہت دیر تک ہوش وحواس متاثر رہے، وہ خبر مشہور ومعروف محقق، علم حدیث کے ماہر، عظیم المرتبت مصنف مولانا ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی کے سانحۂ ارتحال کی تھی، یہ سعودی کلینڈر کے حساب سے ۲ اور ہندوستانی کلینڈر کے اعتبار سے یکم ربیع الآخر ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۰ دسمبر کی صبح کا واقعہ ہے۔ راقم نے یہ خبر خال محترم کو سنائی، وہ بھی سنتے ہی سکتے میں آگئے، اور دیر تک ان کے اوپر بھی اس کا اثر رہا۔ پھر وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اپنے تعلقات اور دوستانہ مراسم کا تذکرہ کرکے ان کی وفات پر اظہار افسوس کرتے رہے۔

ڈاکٹر محمد مصطفیٰ صاحب مئوشہر کے ایک غریب گھرانے کے چشم وچراغ تھے، آنکھ کھولنے کے بعد انھوں نے گھر کی دہلیز پر غربت وافلاس کا سایہ دیکھا، تعلیم وترقی کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں حائل تھیں، لیکن ان کی قوت ارادی اور بلند ہمتی نے تمام موانع اور رکاوٹوں کو پامال کرکے رکھ دیا، اور فضل وکمال کے اس مقام تک پہنچے، جہاں تک رسائی سے پہلے بڑے بڑے حوصلہ مندوں کے ہمت وحوصلے کی کمندیں ٹوٹ جاتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا مولد ومسکن راقم الحروف کے محلے (کیاری ٹولہ) میں ہی تھا، وہ ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے [۱]، ان کے والد مولانا عبدالرحمٰن صاحب دیندار مگر طبیعت ومزاج کے سخت آدمی تھے، اسی لیے وہ (عبدالرحمٰن کڑے) کے نام سے جانے جاتے تھے۔ راقم کے گھر سے ڈاکٹر صاحب کے دیرینہ تعلقات تھے، ہمارے بڑے والد (حاجی مشتاق احمد صاحب) ڈاکٹر صاحب کے اسکول کے

(۱) جائزۃ الملک فیصل العالمیۃ ودلالتہا الحضاریۃ اور ویکیپیڈیا میں ڈاکٹر صاحب کا سن ولادت ۱۹۳۲ء درج ہے، جب کہ ان کی کتاب The History of the Quranic text کے شروع میں مصنف کا جو تعارف پیش کیا گیا ہے، اس میں ۱۹۳۰ء تحریر ہے۔

ساتھی تھے، اس لیے اسکول کی چھٹی کے بعد ان کے اوقات زیادہ تر ہمارے گھر پر ہمارے بڑے ابا وغیرہ کے ساتھ کھیل میں گزرتے تھے، اور یہ تعلقات آخر عمر تک الحمدللہ باقی رہے، سعودی عرب وغیرہ کے قیام کے بعد بھی جب وہ کچھ دنوں کے لیے مئو تشریف لاتے تو اکثر وبیشتر صبح کی چائے راقم کے غریب خانے پر نوش فرماتے، جو ہمارے لیے باعث سعادت ومسرت بھی ہے اور باعث فخر بھی۔

قرآن کریم اور اس وقت کی گھریلو تعلیم کے بعد ڈاکٹر صاحب مڈل سکول میں داخل کیے گئے، لیکن سکول کی تعلیم مکمل ہونے سے پہلے ہی ان کے والد نے مزید تعلیم کے لیے مدرسے میں داخل کردیا، چنانچہ انھوں نے متوسطات تک کی تعلیم دارالعلوم مئو میں حاصل کی، پھر کچھ عرصہ وہ شاہی مراد آباد میں رہے، بعد ازاں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۱ء میں سند فراغ حاصل کی۔

فراغت کے بعد ڈاکٹر صاحب کے لیے سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھنا بڑا چیلنج تھا، گھر کے حالات ان کے لیے انتہائی نامساعد تھے، مزید تعلیم کے لیے ان کے سامنے باد مخالف کے سخت جھونکے تھے، گھر کے لوگ بالخصوص ان کے والد کسی طرح کسی اور تعلیم کے حق میں نہیں تھے، لیکن ڈاکٹر صاحب کے عزم واستقامت کی داد دینی چاہیے، اور اس سے سبق بھی حاصل کرنا چاہیے کہ وہ کسی طرح ناموافق حالات کے سامنے سپر انداز نہیں ہوئے، وہ کسی رکاوٹ کو خاطر میں لائے بغیر پوری ہمت اور قوت ارادی کے ساتھ رواں دواں رہے۔ راقم نے اپنے گھر کے لوگوں سے ان کی عسرت وتنگ دستی اور اسی کے ساتھ ان کی حوصلہ مندی کے جو واقعات سنے ہیں، ان سب کو اگر قید تحریر میں لایا جائے تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔

دیوبند یعنی از ہر ہند سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ دنیا کی قدیم ترین اسلامی درس گاہ جامع ازہر مصر میں داخل ہوئے، وہاں اپنی عربیت کو پختہ کیا، اور ۱۹۵۵ء میں تدریس کی اجازت کے ساتھ عالمیت کی سند حاصل کی۔

بعد ازاں آپ نے درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا، اور پوری عمر علم کی خدمت میں گزار دی، ۱۹۵۶ء میں خلیج کی ریاست قطر میں عربی نہ بولنے والوں کے لیے عربی زبان سکھانے کی مدرسی اختیار کی، اس کے اگلے سال ہی دار الکتب القطریہ (Qatar Library) کے لائبریرین مقرر کیے گئے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اعلی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا، اور ۱۹۶۶ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے علم حدیث پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

قطر میں بارہ سال ملازمت کے بعد ۱۹۶۸ء میں سعودی عرب منتقل ہو گئے، وہیں بود وباش

اختیار کرلی، وہاں کی شہریت حاصل ہوئی، اور اسی کی خاک کا پیوند ہوگئے۔سعودی عرب میں اولاً انھوں نے مکہ مکرمہ کی جامعہ ام القریٰ کے کلیۃ الشریعۃ میں تدریسی خدمت انجام دی۔۱۹۷۳ء میں وہ ریاض کی شاہ سعود یونیورسٹی میں حدیث کے استاد اور پروفیسر مقرر ہوئے، اور ۱۹۹۱ء میں اس منصب سے ریٹائر ہوئے۔

ان کے علمی مقام اور فضل وکمال کے اعتراف میں عالم عرب اور مغربی ممالک کے متعدد علمی اداروں، اکیڈمیوں اور یونیورسٹیوں میں رکنیت اور اہم منصب تفویض کئے گئے، اور ۱۹۸۰ء میں اسلامی علوم کی نمایاں خدمات انجام دینے کا اعتراف کرتے ہوئے اسلامی دنیا کا سب سے بڑا علمی انعام ''شاہ فیصل ایوارڈ'' عطا کیا گیا۔

ڈاکٹر محمد مصطفیٰ صاحب کی علمی خدمات میں نمایاں کام یہ ہے کہ انھوں نے مستشرقین یعنی مغربی ممالک کے ان نام نہاد دانشوروں کا جو اسلامی تعلیمات کا اپنے خاص نقطۂ نظر سے مطالعہ کرکے، اسلام اور اسلامی تعلیمات پر اعتراض اور زبان طعن دراز کیا کرتے تھے، جدید علمی انداز میں دنداں شکن جواب دیا، اور جن مفروضوں کی بنا پر مستشرقین اسلامی تاریخ کو داغ دار کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں اپنی محققانہ کتابوں اور بحثوں سے ان غلط مفروضوں کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے۔ اللہ رب العزت نے مستشرقین کے اعتراضات کے رد وابطال کے لیے متعدد اہل علم کو توفیق عنایت فرمائی، جن میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی نور اللہ مرقدہ کا ہے۔

حدیث وسنت کی خدمت کے سلسلے میں انھوں نے جو یادگار خدمت انجام دی ہے، ذیل میں اس کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے:

صحیح ابن خزیمہ کی تحقیق واشاعت:

ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ-متوفی ۳۱۱ھ-تیسری صدی ہجری کے ایک عظیم محدث تھے، انھوں نے حدیث کی متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں، جن میں سب سے اہم کتاب، ان کی اپنی شرط کے مطابق صحیح احادیث پر مشتمل، وہ مجموعہ ہے، جو صحیح ابن خزیمہ کے نام سے مشہور ہے۔ڈاکٹر صاحب کو اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ ترکی کے شہر استانبول کے ایک کتب خانے میں دستیاب ہوا، یہ نسخہ اگرچہ ناقص تھا اور پوری کتاب پر مشتمل نہیں تھا، لیکن نہایت اہم اور بیش قیمت تھا۔انھوں نے اس کو حاصل کرکے اس پر محنت صرف کی، اس پر حواشی لکھے، اور اس نسخے کی اہمیت، مصنف کے حالات اور دیگر ضروری معلومات پر حاوی ایک مقدمہ لکھ کر قابل اشاعت بنایا،

جس کا پہلا ایڈیشن ۱۳۹۱ھ=۱۹۷۱ء میں المکتب الإسلامی بیروت سے چار جلدوں میں شائع ہوا۔

العلل:

علی بن عبداللہ بن جعفر بن نجیح سعدی -متوفی ۲۳۴ھ- مشہور حافظ حدیث اور اس فن میں اپنے وقت کے امام اور اجلۂ محدثین کا مرجع تھے، امام بخاری جیسے لوگ ان کے زمرۂ تلامذہ میں تھے، یہ محدث علی بن المدینی کے نام سے مشہور تھے، ان کی تصانیف میں ایک مختصر مگر نہایت قیمتی کتاب العلل کے نام سے ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اس کتاب کا قلمی نسخہ بھی استانبول کے اسی کتب خانے میں دستیاب ہوا، جس میں صحیح ابن خزیمہ کا دریافت ہوا تھا۔ اس کتاب کو بھی انھوں نے تحقیق و تعلیق کے بعد ۱۳۹۲ھ =۱۹۷۲ء میں بیروت سے شائع کرایا۔

سنن ابن ماجہ:

یہ کتاب محتاج تعارف نہیں ہے، حدیث شریف کی مشہور کتاب ہے، کتب ستہ میں شامل ہے، اور درس نظامی کا ایک حصہ ہے۔ اس کو بھی ڈاکٹر مصطفیٰ صاحب نے ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔

مغازی عروۃ بن الزبیر:

عروہ بن زبیر -متوفی ۹۴ھ- حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے تھے، مشہور اور جلیل القدر تابعی تھے، روایت حدیث میں بلند رتبہ ہونے کے علاوہ سیرت اور مغازی کے امام تھے۔ ان کی کتاب مغازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر لکھی جانے والی غالباً پہلی کتاب تھی۔ ڈاکٹر مصطفیٰ صاحب نے اس کا بھی قلمی نسخہ حاصل کر کے ایڈٹ کیا، جو ۱۹۸۱ء میں ریاض سے شائع ہوا۔

موطا امام مالک:

امام مالک کی یہ کتاب شہرۂ آفاق ہے، اور دوسری صدی ہجری میں جب یہ کتاب لکھی گئی تھی، اس وقت سے لے کر آج تک اہل علم اور محدثین کا مستند ترین مرجع اور ماخذ ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کے بھی مختلف نسخوں کا مقابلہ کر کے اس کی تحقیق کی، جو آٹھ جلدوں میں شائع ہوئی۔

کتاب التمییز:

امام مسلم بن الحجاج قُشیری -متوفی ۲۶۱ھ- کی کتاب صحیح مسلم سے مسلمانوں میں کون ایسا شخص ہے جو ناواقف ہوگا۔ انھوں نے صحیح مسلم کے علاوہ بھی دسیوں کتابیں تصنیف کی تھیں۔ ان کی ایک مبارک یادگار کتاب التمییز نامی کتاب ہے، جس کا ایک نامکمل لیکن نادرۂ روزگار نسخہ ڈاکٹر صاحب کو دمشق کے مکتبہ

ظاہریہ میں دستیاب ہوا تھا، ان کے بقول یہ نسخہ صرف پندرہ اوراق پر مشتمل تھا۔ یہ نسخہ مسلمانوں کا ایک اہم علمی سرمایہ اور امام مسلم کی یادگار ہونے کے علاوہ اس حیثیت سے نہایت اہمیت کا حامل تھا، کہ اس سے اسلام کی علمی وثقافتی تاریخ اور خاص طور سے علم حدیث میں ''علم نقد'' کے اعلیٰ معیار اور اس کے نشو ونما پر روشنی پڑتی ہے، امام مسلم کی یہ کتاب فن نقد پر ہے، اور اسی مناسبت سے ڈاکٹر صاحب نے اس پر ایک طویل مقدمہ زیب قرطاس فرمایا ہے، جس میں اس فن کی نشو ونما کے علاوہ متعدد مستشرقین کی ہرزہ سرائیوں کا بھی جواب دیا ہے۔ یہ کتاب ریاض سے- غالبًا - ۱۳۹۵ھ میں شائع ہوئی ہے۔

مذکورہ بالا کتابوں کی تحقیق وتعلیق کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے متعدد علمی وتحقیقی کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

دراسات في الحديث النبوي وتاريخ تدوينه:

یہ کتاب دراصل ان کا ڈاکٹریٹ کا وہ مقالہ ہے جس کو انھوں نے انگریزی زبان میں تحریر کیا تھا، اور بعد میں اس کا عربی ترجمہ مذکورہ بالا نام سے شائع ہوا، اس کتاب میں انھوں نے تفصیل سے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے، جو مستشرقین احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر کیا کرتے تھے، اور ان اعتراضات کی بنا پر حدیث کی حجیت کو مشکوک ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

منهج النقد عندالمحدثين نشأته وتاريخه:

اس کتاب میں انھوں نے روایتوں کی تنقید، ان کی بحث وتمحیص اور جانچ پڑتال کے لیے محدثین کا جو اعلیٰ معیار تھا، اس پر بحث اور گفتگو کی ہے، اور ائمہ حدیث خاص طور سے ماہرین جرح وتعدیل کے تنقیدی شعور اور بالغ نظری کو اس انداز سے ثابت کیا ہے کہ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ محدثین کے ہاں تنقید کا جو پیمانہ اور کسوٹی تھی اس معیار پر آج کی علمی ترقیات کے باوجود دنیا اور خاص طور سے یورپ کی تنقید اپنے تمام بلند بانگ دعووں کے باوجود نہیں پہنچ سکی۔ تنقید کے اس بلند معیار کو حدیث کی حجیت اور اس کی استنادی حیثیت کو ثابت کرنے میں بھی بہت بڑا دخل ہے، جس سے انکار کرنا ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا، اس کے بعد کئی ایڈیشن اشاعت پذیر ہوئے۔

کُتّاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۳۹۴ھ=۱۹۷۴ء میں بیروت سے شائع ہوا تھا، اس میں انھوں نے ۴۸/ ایسے لوگوں یا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا احوال لکھا ہے جو کتابت وحی پر مامور

تھے، یا جنھوں نے کسی وقت کتابت وحی کی خدمت انجام دی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کا آنحضرت ﷺ کے کاتبوں میں ہونا مستند حوالوں اور مراجع سے ثابت کیا ہے۔ اس فہرست میں جس طرح وہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں جنھوں نے قرآن کریم کی کتابت کی خدمت انجام دی تھی، اسی طرح وہ بھی ہیں جنھوں نے آپ ﷺ کے مکاتیب ورسائل اور خطوط کو قید تحریر میں لانے کی سعادت حاصل کی تھی۔

The history of the Quranic text from revelation to compilation.

ڈاکٹر صاحب کی یہ ایک بہت ہی اہم کتاب ہے، جس میں انھوں نے نہایت مستند طریقے سے قرآن کریم کی جمع وتدوین کی تاریخ کو بیان کیا ہے، اور مستشرقین کے اعتراضات اور شکوک وشبہات کا علمی اور معروضی انداز میں جواب دیا ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن کریم آج تک اسی طرح تر وتازہ ہے، جس طرح پیغمبر آخرالزماں جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا تھا، اور اس میں کہیں بھی ذرہ برابر تحریف وتبدیل نہیں ہوئی ہے، اور نہ آئندہ ہونے کا امکان ہے۔

ان علمی کارناموں کے علاوہ مئوشہر میں ان کی متعدد یادگاریں ان کے لیے صدقۂ جاریہ کا ذریعہ ہیں، انھوں نے شہر کے محلّہ منشی پورہ میں ایک عالیشان مسجد جس کا نام مسجد بلال ہے، اپنے خرچ سے تعمیر کرائی، ان کے اپنے محلے میں واقع اپنی ایک مملوکہ عمارت کو مسلم بچوں اور بچیوں کی تعلیم کے لیے وقف کیا، جس میں دارالعلوم ایم ایم اعظمی اسکول قائم ہے۔

مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ان کی فکرمندی اور اس سلسلے میں ان کی فراخ دلی کا ایک بین ثبوت یہ ہے کہ ان کو جب فیصل ایوارڈ کی خطیر رقم ملی، تو انھوں نے وہ پوری رقم مسلمانوں کے غریب اور نادار طلبہ کی تعلیم کے لیے عطیہ کردی۔

محدث جلیل حضرت علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے نیازمندانہ تعلقات اور ان کے خلف الرشید حضرت مولانا رشید احمد صاحب سے دوستانہ مراسم تھے۔ مسجد بلال کی تعمیر جب مکمل ہوگئی، اور اس موقع سے وہ مئو تشریف لائے، تو مسجد کا افتتاح حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے کرایا۔ احقر نے جب ''حیات ابوالمآثر'' لکھی اور اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کی مئو تشریف آوری ہوئی، تو ان کی خدمت میں اس کو پیش کیا۔ انھوں نے کتاب کا مطالعہ کیا اور دو دن کے بعد اس میں درج معلومات پر بڑی محبت وشفقت کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا۔ اس کے بعد والے سفر میں جب وہ تشریف لائے اور راقم

الحروف حاضر خدمت ہوا تو دریافت فرمایا کہ تمھاری کتاب سب نکل گئی، یا نہیں؟ راقم نے عرض کیا کہ ابھی تو بہت پڑی ہوئی ہے، تو بہت افسوس کے ساتھ کہنے لگے کہ ہمارے لوگوں کا یہ حال ہے کہ مولانا (حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ) سے عقیدت ومحبت کا دعویٰ ہر آدمی کرے گا، لیکن ان کے سوانح پر لکھی ہوئی کتاب کے ایک ہزار نسخے اتنے بڑے شہر میں نہیں نکل سکے۔

راقم نے حدیث شریف کی ایک نایاب کتاب ''مسند حارث بن ابی اسامہ'' کی خدمت انجام دی ہے، اس کام کے آغاز کے ابتدائی عرصے میں ڈاکٹر صاحب ایک دفعہ مئو تشریف لائے اور ان کو اس کام کا علم ہوا تو انھوں نے مفید مشوروں سے نوازا۔ اسی دوران ایک دن وہ محدث الاعظمی لائبریری تشریف لائے تو کافی دیر تک اس میں رہے، ان کو حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی بلند پایہ تصنیف **الحاوي لرجال الطحاوي** کا مسودہ دکھایا گیا، تو اس کو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے، اور یہ مشورہ دیا کہ اس کتاب کو کمپوز کرکے طباعت کے علاوہ کچھ نسخے اس مسودے کی کاپی کرکے بعینہ طبع کرانے چاہئیں تاکہ اہل علم دیکھیں کہ ہندوستان کے علماء نے کس طرح علمی کارنامے انجام دیے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے پوری عمر اشاعت علم، تصنیف وتالیف اور تحقیق میں صرف کردی، ان کی وفات سے علمی دنیا کا زبردست نقصان ہوا ہے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ان کی خدمات کو اپنے فضل سے قبول فرمائے، ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، اور ان کی رحلت سے واقع ہونے والے خلا کو پُر فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

....

بڑے ابا حاجی مشتاق احمد صاحب

۱۰؍جمادی الاولی ۱۴۳۹ھ = ۲۸؍جنوری ۲۰۱۸ء کو راقم کو ایک اور سانحہ سے دوچار ہونا پڑا۔ میرے والد صاحب کے سب سے بڑے بھائی حاجی مشتاق احمد صاحب مختصر سی علالت کے بعد تقریباً ۹۰ برس کی عمر میں سفر آخرت پر روانہ ہوگئے، إنا للّٰہ وإنا إلیه راجعون.

بڑے والد ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمی صاحب علیہ الرحمہ کے اسکول کے ساتھی اور خال محترم حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ کے حلقۂ احباب میں تھے، انھوں نے عصری تعلیم حاصل کی، مئو میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد بنارس ہندو یونیورسٹی میں داخلہ لیا، تحصیل علم کے بعد تجارت اور کاروباری مشاغل میں مشغول ہوگئے، اور آخر تک اس سے وابستہ رہے، اور پوری ایمانداری ودیانت داری کے

ساتھ وہ کسب معاش اور تجارت پر عمل پیرا رہے۔

دیندار محتاط اور معمولات کے پابند تھے، تین مرتبہ حج کی سعادت سے مشرّف ہو چکے تھے۔ نماز کے بہت پابند تھے۔ راستہ چلتے ہوئے نگاہ ہمیشہ نیچی رکھتے۔ خوش اخلاق، ہنس مکھ اور ملنسار تھے۔ متعلقین سے ہمیشہ ملتے جلتے رہتے، اور سب سے خوش اخلاقی اور خوش دلی سے پیش آتے، غیبت اور شکوہ شکایت سے گریز کرتے، دل میں کسی سے بغض اور کینہ نہیں رکھتے حتیٰ کہ بچوں سے بھی گھلے ملے رہتے۔ مزاح پسند تھے اور جس مجلس میں بیٹھتے اپنی مزاحیہ باتوں اور لطائف وظرائف سے لوگوں کو مسرور اور محظوظ کرتے۔

کاروباری مشاغل کی وجہ سے انھوں نے اسفار بہت کیے تھے، ہندوستان کے اکثر علاقوں کا سفر کیا تھا، جس کی وجہ سے ان کے تجربات بھی بہت وسیع تھے۔ پیدل چلنے کے عادی تھے، اور زیادہ تر پیدل ہی چلنے کو ترجیح دیتے تھے۔ شکار کے بھی وہ شوقین تھے۔ راقم کی ابھی طالب علمی کا زمانہ تھا، اس وقت ایک دفعہ اپنے ساتھ شکار میں لے گئے تو ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک تقریباً ۸-۹ کلومیٹر پیدل چلے اور راقم کو بھی چلایا۔

جنوری کے شروع میں ان کو بلڈ پریشر کی کمی کی شکایت ہوئی، اسی وقت سے صحت متاثر ہوتی گئی، لیکن بالکل صاحب فراش نہیں ہوئے۔ انتقال سے صرف ایک دن پہلے بیماری میں اضافہ ہوا، اور ۲۸ر جنوری کی شام کو جان جان آفریں کے سپرد کردی، دوسرے روز تجہیز وتکفین اور تدفین عمل میں آئی۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے، ان کی قبر کو جنت کا باغ بنائے، اور درجات کو بلند فرمائے۔ آمین۔

....

انوار احمد خاں صاحب

۱۶ر جمادی الاولی ۱۴۳۹ھ = ۳ر فروری ۲۰۱۸ء کو صبح میں جناب انوار احمد خاں صاحب طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے، إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون.

مرحوم مئو کے محلّہ ملک ٹولہ کے رہنے والے تھے۔ دیندار، پابند صوم وصلاۃ اور بہت محنتی وجفاکش تھے۔ حضرت محدث جلیل رحمۃ اللہ علیہ سے نہایت گہری عقیدت رکھتے تھے، اور ان سے بے پناہ محبت کرنے والے تھے۔ ان کے دیرینہ خدمت گزاروں میں تھے، کسی بھی وقت کوئی کام پیش آجائے خدمت کے لیے حاضر رہا کرتے تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد آپ کے خلف الرشید حضرت مولانا

رشید احمد صاحب دامت برکاتہم سے بھی اسی طرح تعلق رہا، اور ہمیشہ خدمت میں حاضری دیتے رہے۔

مدرسہ مرقاۃ العلوم کے مخلص اور جاں نثار خدام میں تھے۔ اس کے لیے فراہمیٔ سرمایہ میں شب وروز محنت کیا کرتے تھے۔ رمضان المبارک میں کئی کئی سفراء کے برابر تنہا کام کرتے، کبھی کبھی سحری کے بعد گھر سے نکلتے تھے تو افطار یا تراویح کے بعد واپس آتے تھے۔ مدرسہ کے مطبخ کے لیے غلہ، سبزیاں اور دیگر اشیاء خوردنی کی خریداری بہت دلچسپی سے کیا کرتے، اور اس میں کفایت شعاری کو مدنظر رکھتے، اور بغیر کسی لالچ اور معاوضہ کے یہ خدمت انجام دیتے۔

ایک سال سے زیادہ سے بستر علالت پر تھے۔ چند سال پیشتر پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ علاج کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوگئے، مگر پھر بیمار پڑے تو اٹھ نہیں سکے، تا آنکہ ۱۶؍ جمادی الاولیٰ مطابق ۳؍ فروری کو وقت موعود آپہنچا۔ اسی روز بعد نماز مغرب نماز جنازہ ادا کی گئی، اور لب دریا واقع قبرستان میں سپرد خاک کردیے گئے۔

اللہ سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے، کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، نیک روحوں کے ساتھ ان کا حشر فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین۔

....

حاجی محمد یسین صاحب

یکم جمادی الاخریٰ ۳۹ھ = ۱۸؍ فروری ۱۸ء بروز یکشنبہ حاجی محمد یسین صاحب ساکن محلّہ پٹھان ٹولہ، مئو، کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا، إنا للّٰه وإنا إليه راجعون.

مرحوم شریف الطبع، دیندار اور سیدھے سادے انسان تھے۔ پنج وقتہ نمازوں کے بہت پابند تھے، جب تک صحت سے رہے مسجد میں بہت پہلے آنے کا اہتمام کیا کرتے تھے، گفتگو اور بات چیت میں نرم تھے۔ مدرسہ مرقاۃ العلوم کی مشاورتی کمیٹی کے رکن تھے، اور اس کی نشستوں میں پابندی سے شرکت کیا کرتے تھے۔

عرصہ سے بیمار تھے، درمیان میں کبھی بیماری میں کچھ افاقہ ہوا تو چلنے پھرنے کے قابل ہوگئے، مگر پھر بستر پر پڑے تو آخر تک اٹھ نہیں سکے۔ جس دن انتقال ہوا، اسی دن بعد نماز ظہر ان کی نماز جنازہ اور تدفین عمل میں آئی۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ مرحوم کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔